مولانا اختر امام عادل

جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور، بہار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل

(اپنے موضوع پر سب سے پہلی شائع شدہ کتاب)

حضرت مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

بانی و مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور

شائع کردہ

مفتی ظفیر الدین اکیڈمی جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب:............... غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل

مصنف:................ مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

قیمت:............... ۴۵؍روپے

صفحات:.............. ۱۴۴؍

کتابت:................ الکلام کمپیوٹر اینڈ پرنٹرس، امیر منزل نزد چھتہ مسجد دیوبند

تعداد اشاعت:......... ۱۱۰۰؍

ناشر:..................... جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور (بہار)

ملنے کے پتے:

(۱) مکتبہ جامعہ ربانی منورواشریف،
پوسٹ: سوہما، وایا: بتھان، ضلع: سمستی پور (بہار)

(۲) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند (یوپی)

(۳) مکتبہ الامام سی ۲۱۲ شاہین باغ ابوالفضل پارٹ ۲ اوکھلا، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

آج مختلف اسباب ومحرکات کے تحت غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مقیم ہے،اوروہ اپنے حالات وظروف کے لحاظ سے پوری طرح مطمئن ہے،اوروہاں سے واپسی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ان ملکوں میں غیراسلامی نظام قانون اورسماجی روایات کی بناپر متعدد مسائل ومشکلات پیدا ہوگئے ہیں، ان پرغورکرنا علماء کا فریضہ ہے،آج ان پر شریعت اسلامی کے روح ومزاج اوراسلامی اصول وکلیات کی روشنی میں پوری دقت نظری کے ساتھ غورکرنے کی ضرورت ہے۔

اسی ضرورت کے پیش نظر آج مختلف ملکوں میں ان مسائل پرغوروفکر کا سلسلہ جاری ہے اورالحمدللہ علماء کی مساعی سے فقہ الاقلیات پر بحث ونظر کا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، اللہ جزائے خیردے،اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کواس نے عصرحاضر کے اس حساس مسئلہ پرسوال نامہ مرتب کیا اورعلماء اوراہل نظرکواس پرغورکرنے کی دعوت دی،خدا کرے کہ علماء کے بحث ومذاکرہ سے کوئی اچھی چیز سامنے آئے ،اوروہ امت مسلمہ کے لیے مفیداور باعث خیر ثابت ہو(آمین)

میرے ذہن میں اس طرح کے مسائل تھے اور میں ان پرغورکرنا چاہتا تھا، اسلامک فقہ اکیڈمی کے اس سوال نامہ سے میرے فکرونظر کومہمیز لگی ،اورمیں نے اس طرح کے مسائل کی ایک فہرست بنائی ،اور اپنے مطالعہ کے نتائج لکھنے شروع کیے، اگر چہ تدریسی اور انتظامی مصروفیات اوربعض طویل اسفار کی بناپر درمیان میں وقفہ وقفہ کے لیے تعطل آتا رہا،لیکن اس دوران بھی میرے مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا اوربعض بیرونی اسفار سے غوروفکر کے نئے پہلو دریافت ہوتے رہے، اس طرح اس حاصل مطالعہ کی روشنی میں ایک مقالہ تیار ہوگیا ،بعض رسالوں میں اس کے بعض حصے شائع ہوئے ،تواہل علم نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اوربعض احباب کا اصرار ہوا کہ یہ پورا مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوجائے تو بہتر ہے،

آج وہ حاصل مطالعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ نہ کوئی فتوی ہے اور نہ آخری تحقیق یہ صرف ایک طالب علمانہ احساسات، اور میرے اب تک کے مطالعہ وفکر کا نچوڑ ہے علماء اس پر تنقید و تحقیق کی نظر ڈالیں اور مجھے اپنی آراء اور تحقیقات سے آگاہ کریں، اس طرح امید ہے کہ کوئی آخری درجہ کی چیز امت کے سامنے آسکے گی، انشاء اللہ۔

میں اپنے تمام معاونین اور دوستوں کا بالخصوص جناب عبدالرب کریمی صاحب یونیورسل پیس فاؤنڈیشن دہلی، مولانا محمد سعد اللہ قاسمی، اور برادر عزیز مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا شکر گذار ہوں جن کی محنت واخلاص سے اس کتاب کی طباعت واشاعت کا کام آسان ہوا، اللہ ان حضرات کو جزائے خیر سے نوازے، آمین

میں اس موقعہ پر اپنے محسن ومربی حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب (مفتی دارالعلوم دیوبند) کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جن کی نظر عنایت سے مجھے کسی درجہ میں فقہی موضوعات پر لکھنے پڑھنے کا شعور پیدا ہوا، اور جنہوں نے اس مقالہ پر ایک نظر ڈال کر اپنی رائے بھی تحریر فرمائی۔

میں جامعہ ربانی کے ارباب انتظام کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اور وسائل کی کمی اور بے سروسامانی کے باوجود عصر حاضر کے ان حساس مسائل پر طباعت کے اخراجات کا متحمل ہوا، اللہ تعالی ان تمام حضرات کو اپنی شایان شان جزائے خیر سے نوازے اور ان کو اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے، آمین۔

اختر امام عادل قاسمی
جامعہ ربانی منوروا شریف
۷/ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رائے گرامی

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

غیر مسلم ممالک جہاں مسلمان آباد ہیں ان کو وہاں ، بہت سے ایسے ملکی مسائل پیش آتے ہیں جوان کے مذہب کے موافق نہیں ہیں، اوران کوان سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اوران سے ہوکر گذرنا پڑتا ہے، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا ہے، ایسے نازک وقت میں وہ اپنے کو بڑی مصیبت میں مبتلا پاتے ہیں ۔ اسلام نے ایسے وقت مسلمانوں کے لیے کیا رہنمائی کی ہے ضرورت تھی کہ اس پر روشنی ڈالی جائے ۔

اللہ تعالی جزائے خیر دے برادر عزیز مولانا مفتی اختر امام عادل سلمہ کو، انہوں نے ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے، اور ایک مختصر کتاب مرتب کردی ہے، اور کتاب وسنت اور تاریخ کی روشنی میں اچھی بحث کی ہے، اور الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کی سعی کی ہے،

انہوں نے شروع میں لکھا ہے کہ عہد نبویؐ میں تین طرح کی زندگی اہل اسلام نے گذاری ہے مکی زندگی جہاں قریش برسر اقتدار تھے، اور مسلمان ان کے زیر اقتدار زندگی گذار رہے تھے، مکی زندگی میں ان کو مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی، وہ عبادت بھی چھپ کر ادا کرتے تھے، اور طرح طرح کے مصائب وآلام کے شکار تھے خود سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم جن کو قریش صادق وامین کے لقب سے یاد کرتے تھے، کو بھی کھل کر عبادت کرنے کی اجازت نہیں تھی، مسلمان دن رات مظالم کے شکار تھے، مجبور ہو کر ان کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی جہاں کا حکمران عیسائی تھا، اہل مکہ نے وہاں بھی ان کا تعاقب کیا پھر وقت آیا کہ اللہ تعالی کے حکم سے خود سرور کائنات ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور وہاں اشاعت اسلام کی خدمت

انجام دی، اور دراصل اسلام کا بول بالا یہیں سے ہوا، چھوٹی، بڑی دس سال میں ۷۴ر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔

مصنف نے بتایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو یہود مدینہ سے معاہدہ کرنا پڑا جو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے، اس معاہدہ کی تفصیل نقل کی ہے، ان تینوں دور میں جو کچھ مسلمانوں کو پیش آیا، اس پر روشنی ڈالنے کے بعد جمہوری ممالک جہاں انتخاب کے ذریعہ حکومت بنتی بگڑتی ہے اس پر بحث کی ہے اور طریقہ انتخاب میں مسلمانوں کو حصہ لینا چاہئے یا نہیں پھر حصہ کس طرح لیا جائے کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر بحث کی ہے، اور دلپذیر بحث کی ہے، اور اس کے گوشوں پر نظر ڈالی ہے، اس طرح کے تعدد مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے جو کچھ لکھا ہے وہ سب مدلل ہے، اس کے پڑھنے سے ذہن وعقل کو روشنی ملتی ہے،

یہ کتاب مسلمانوں اور اہل علم کے لیے بڑی کارآمد ہے، اور موجودہ زمانہ کے لیے اس کا جاننا اور پڑھنا اہل علم کے لیے ضروری ہے، تاکہ وہ غیر مسلم ملک میں کامیاب زندگی گذارنے کا سلیقہ جان جائیں، اور جائز وناجائز اور حلال وحرام کی پوری تمیز ان کو بڑی آسانی سے حاصل ہو جائے، دعا ہے رب العلمین سے اس کو مولانا کے لیے زاد آخرت بنائے، اور مسلمانوں کے رہنما اور رہبر کی حیثیت عطا کرے، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

طالب دعاء: **محمد ظفیر الدین غفرلہ**
مفتی دار العلوم دیوبند
۲۷ر شعبان ۱۴۲۴ھ

اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، قرآن وحدیث اور سیرتِ نبویہ کی صورت میں اس نے

جو تعلیمات پیش کی ہیں وہ انسانی تاریخ کے ہر دور کے لئے کافی ہیں، بشرطیکہ ہمارے پاس دلِ دانا اور چشمِ بینا موجود ہو۔

قرآن کا نزول تدریج کے ساتھ ہوا، سیرتِ نبویہ کے قانونی اور اخلاقی نمونے رفتہ رفتہ دنیا کے سامنے آئے، یقیناً اس تدریج میں اسلام اور مسلمانوں کے حق میں دنیا کے سیاسی اور سماجی حالات کا دخل تھا، اگر پورا قانون اور سیرتِ طیبہ کے تمام اعلیٰ اخلاقی نمونے بیک دفعہ پیش کر دیئے جاتے تو ممکن تھا کہ حالات میں ان کے تحمل کی گنجائش نہ ہوتی، اس لئے قانون کے تدریجی عمل میں ایک طرف حالات کی تبدیلی کی رعایت کی گئی، تو دوسری طرف مسلمانوں کے حق میں مخصوص احوال وظروف کی تعمیر، اور مطلوبہ معاشرہ کی تشکیل کا عمل بھی جاری رکھا گیا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے (جس میں بڑی حد تک واقعیت بھی ہے) کہ اسلام کے ابتدائی دور کے احکام اسلام کے دورِ عروج کے احکام کے ذریعہ منسوخ ہوگئے، اور اس طرح پچھلے احکام اگلے احکام سے منسوخ ہوتے چلے گئے، لیکن یہ تصوّر عبادات، حکومتِ اسلامیہ کے داخلی مسائل، اور مسلمانوں کے باہمی معاملات کی حد تک تو درست ہے، لیکن مسلمانوں کے خارجی مسائل، یا غیر مسلم اقوام سے ان کے سیاسی اور سماجی تعلقات کو اس عموم میں داخل کرنا مناسب نہیں، اس باب میں اسلامی احکام میں جو تغیرات ہوئے ہیں، یا سیرتِ طیبہ کے عملی نمونوں میں جو فرق نظر آتا ہے ان میں نسخ سے زیادہ تبدیلیٔ حالات کا دخل معلوم ہوتا ہے، اور حالات کی تبدیلی کی بنا پر جو احکام عائد ہوں ان کا نام نسخ نہیں تطبیق ہے، ایک فقیہ اور ماہرِ قانون کے لئے ضروری ہے کہ وہ غور کرے کہ کون سا حکم کس قسم کے حالات پر منطبق ہوتا ہے، آج خیر القرون کے مجتہدین تو نہیں پیدا ہو سکتے، لیکن اس درجہ امتیاز اور قوتِ ادراک تو پیدا ہو سکتا ہے جس کے ذریعہ انسان مدارجِ احکام کو پہچان سکے، اور ہر حکم کو اس کے صحیح محمل پر رکھ سکے۔

عہدِ نبویؐ کے تین ادوار

مسلمانوں کے خارجہ مسائل اور غیر مسلموں سے تعلقات کے باب میں ہمارے سامنے عہدِ نبویؐ میں اِسلامی اَدوار کے تین نمونے ہیں، (۱) مکی دَور (۲) حبشہ میں مسلمانوں کے قیام کا دَور (۳) اور مدنی دَور ـــــ یہ تینوں ادوار مسلمانوں کے ہر دَور کے مسائل کے لئے بنیادی ہدایات فراہم کرتی ہیں، یہ تین اَدوار درا صل مسلمانوں کی سیاسی صورتِ حال کے تین علامتی نمونے ہیں۔

(۱) مکی دور : مسلمانوں کی حالتِ مغلوبی کی علامت ہے، یعنی ایسا معاشرہ جس میں مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن غیر مسلموں کے مقابلے میں کمزور ہو اور مسلمان ایک کمزور اَقلّیت کی صورت میں غیر مسلموں کی مضبوط اکثریت کے درمیان رہ رہے ہوں، جس میں نہ احکام اسلامی پر آزادانہ عمل کی گنجائش ہو، اور نہ کسی قسم کی قومی یا مذہبی تنظیم سازی کی۔

(۲) حَبشہ کا دور : مسلمانوں کی حالت آزادی کی علامت ہے یعنی ایسا معاشرہ جس میں مسلمان سیاسی اور قومی طور پر تو اَقلّیت میں ہوں، لیکن مذہبی طور پر وہ آزاد ہوں، اور مسلمان غیر مسلم اکثریت کے درمیان ایک باعزّت اقلّیت کی صورت میں رہ رہے ہوں، جہاں مسلمانوں کو اپنی سیاسی اور قومی خدمات پیش کرنے کا اختیار حاصل ہو، حَبشہ میں نجّاشی کی حکومت تھی اور اس طرح کی شہنشاہیتوں میں عوام کو تشکیلِ حکومت کا موقع نہیں ملتا، لیکن ان کو اپنی فوجی اور سیاسی خدمات پیش کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور اس عموم میں مسلمان بھی شامل تھے جیسا کہ حبشہ میں ایک جنگ کے موقعہ پر مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے حضرت زُبیر کی فوجی خدمات سے اندازہ ہوتا ہے۔ (سیرت ابن ہشام: جلد ۱، صفحہ ۳۶۱)

(۳) مَدنی دَور : مسلمانوں کے حالت غلبہ کی علامت ہے، البتہ اس دَور کے

دو حصے ہیں، اس کا ابتدائی دور مسلمانوں کی سیاسی قوّت کی تشکیل وتعمیر کا دَور ہے، جس میں مسلمان باوجود اکثریت کے ایک دوسری غیر مسلم اقلیت (یہود) کے ساتھ سیاسی معاہدہ کرتے ہیں تا کہ ان کے اشتراک یا ان کی طرف سے یک گونہ اطمینان کے بعد مسلمان اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں مشغول ہوسکیں، اور رفتہ رفتہ ایک وحدانی طاقت میں تبدیل ہوسکیں، چنانچہ مدنی دور کے ابتدائی حصہ میں جو معاشرہ یا جوامت تشکیل دی گئی اس میں یہود بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شامل تھے، اس میں غیر مسلم اقلیت کے ساتھ بڑی مراعات رکھی گئی تھیں اور حتی الامکان مسلمان اپنے دفاعی اور خارجی مسائل میں غیر مسلموں کے عملی اشتراک کو اہمیت دیتے تھے، اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا، اور مسلمان اپنی اخلاقی قوت، دعوتی جدوجہد، اور تنظیمی صلاحیتوں کے ذریعہ مضبوط ہوتے چلے گئے، اور پھر مدنی دور کا وہ آخری مرحلہ شروع ہوا جو مسلمانوں کے خالص غلبہ کا سلامتی دور ہے، جس میں غیر مسلم اقلیت ایک مغلوب قوت کی صورت میں رہ سکتی تھی، مذہبی اور اقتصادی تمام تر آزادی کے باوجود سیاسی مسائل میں مسلمانوں پر دخیل نہیں ہوسکتی تھی، یہ دور عہدِ نبویؐ کے آخر تک برقرار رہا، اور اس میں جغرافیائی طور پر توسیعات ہوتی رہیں، یہاں تک کہ عرب کا زیادہ تر علاقہ عہدِ نبوت ہی میں اسلام کے اس دور غلبہ کے دائرہ میں داخل ہو چکا تھا، اور غیر مسلموں سے تعلقات کا دائرہ اخلاقی اور سماجی طور پر پوری طرح ہونے کے باوجود کم از کم سیاسی اور دفاعی سطح پر بہت زیادہ محدود ہوگیا تھا۔___ عہدِ نبوت کے بعد عہدِ خلافتِ راشدہ میں اسی دور غلبہ کی توسیع ہوئی اور رفتہ رفتہ مسلمان روئے زمین کی سب سے بڑی طاقت بن گئے، اور صدیوں تک مسلمانوں نے ایک غالب قوت کی حیثیت سے ملکوں اور قوموں پر حکمرانی کی''۔

ہمارا فقہی سرمایہ :

ہمارے فقہی ذخیرہ کا بڑا حصہ اس عہدِ غلبہ کی یادگار ہے، اسی دور میں علماء اور فقہاء نے مسلمانوں کو ایک غالب قوت تسلیم کرتے ہوئے غیر مسلموں کے مسائل ومعاملات پر گفتگو کی، ظاہر ہے کہ اس حصہ میں جس طرح کی صورتِ حال سامنے تھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے

درمیان تعلقات کی جو نوعیت ممکن تھی فقہاء نے اسی کے مطابق احکام کا استخراج کیا۔اور اسی لئے ہمارے یہاں **کتاب السیر**، **کتاب الجہاد**، **کتاب الصلح**، **کتاب البیوع**، اور **کتاب الحظر والاباحۃ** وغیرہ میں جو مسائل ملتے ہیں ان میں اسی عہدِ غلبہ کی جھلک ملتی ہے، اوراسی لئے امام مالکؒ کی **المدونۃ**،امام ابو یوسفؒ کی **کتاب الخراج**، امام محمدؒ کی **ظاھر الروایۃ** اورامام شافعیؒ کی **کتاب الام** سے فتاویٰ عالمگیری،شامی بلکہ **مجلۃ الاحکام العدلیۃ** تک تمام فقہی کتابوں میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت پر بالعموم ایک ہی انداز کی بحثیں ملتی ہیں۔

اُس دور میں یہ کہاں سوچا جاسکتا تھا، کہ تاریخ پھر اپنے آپ کو دُہرائے گی ،اور مسلمان پھر کبھی مدینہ کے ابتدائی دور، یا حبشی اور مکّی دور میں پہونچ جائیں گے ___ حالاں کہ حدیث پاک میں اشارہ کردیا گیا تھا کہ **بدأ الاسلام غریبًا وسیعود کما بدأ**

(رواہ مسلم ، مشکوٰۃ: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ صفحہ ۲۹)

’’یعنی دین کا آغاز جس غُربت کے ساتھ ہوا ہے وہ تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے گی‘‘

ایک بُنیادی فَرق:

یہی فرق ہے قرآن وحدیث کی کلیات اور فقہی مجتہدات کے درمیان،قرآن وحدیث کی کلیات میں انسانیت کے ہر طبقہ اور ہر دَور کی رِعایت پہلے سے ملحوظ رکھی گئی ہے،اور یہی اس کی اَبدیت کا راز ہے،اس کے بَرخلاف ہر دَور کے فقہی مجتہدات صرف اس دور یا اس کے آس پاس کے حالات پر مبنی ہوتے ہیں،اور اسی لئے فقہی مجتہدات احوال وظروف کے اختلاف سے مختلف ہوتے رہتے ہیں،جبکہ قرآن وحدیث کی کلیات میں کسی دَور میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں،فقہاء صرف اپنے دَور کے حالات وواقعات کے پابند ہوتے ہیں،اور اگر ممکنہ صورتیں فرض بھی کرتے ہیں تو بالعموم انہی حالات وظروف کے آئینے میں جو ان کے پیشِ نظر ہوتے ہیں،حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کی فقہ تقدیری اس معنی میں ایک بہت بڑا انقلابی قدم تھا۔لیکن بعد کے ادوار میں اس فقہ تقدیری کو کافی دُور تک لے جانے والے لوگ بالعموم نہیں ہوئے ،اور فقہاء زیادہ تر اپنے

دَور کے حالات و مسائل پر اپنی اجتہادی قوت صرف فرماتے رہے، جس کی ضرورت تھی اور جس کے وہ پابند تھے۔

فقہ الاقلیات کی بنیاد:

غرض امتِ مسلمہ کے موجودہ سیاسی زوال کے دَور میں جب کہ متعدد علاقوں میں مسلمان نہ صرف یہ کہ قوّت واقتدار سے محروم ہیں، بلکہ ایسی اکثریت بھی نہیں رکھتے جو حکومتوں یا دیگر اقوام پر اثر انداز ہو سکے، ایسی صورتِ حال میں امتِ مسلمہ کی زیادہ تر رہنمائی عہدِ نبوی کے مذکورہ بالا تین علامتی نمونوں میں سے کسی نمونے میں مِل سکتی ہے، ہمارا فقہی اَثاثہ اس سلسلے میں بڑی حد تک خاموش ہے، بعض اشارات ضرور موجود ہیں، اور سلف کے اشارات بھی خَلف کے لئے کافی اہمیت رکھتے ہیں، اس لئے فقہ الاقلیات پر کام کرنے والے علماء کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اشارات کو بھی مشعلِ راہ کے طور پر سامنے رکھیں۔

غیر مسلم ملکوں میں قیام وسکونت کی شرعی حیثیت

موجودہ دور میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد غیر مسلم ملکوں میں آباد ہے، صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد صحیح اعداد وشمار کے مطابق قریب ۳۰ رکروڑ سے کم نہیں ہے، جو اس وقت دنیا کے کسی ایک ملک میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ہے۔

چین میں پندرہ کروڑ، متحدہ روس میں دو کروڑ، یورپ میں ایک کروڑ اسی لاکھ، امریکہ میں اسی لاکھ مسلمان آباد ہیں، اسی طرح افریقی ملکوں مثلاً تنزانیا، اوگنڈا، کینیا اور جنوبی افریقہ اور ایشائی ملکوں میں سنگاپور، سری لنکا، نیپال وغیرہ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد مقیم ہے۔

غیر مسلم ملکوں کے مسائل میں شرعی طور پر سب سے پہلا سوال ان ملکوں میں قیام وسکونت کی شرعی حیثیت کا اٹھتا ہے، کہ مسلمانوں کے لیے غیر اسلامی ملکوں میں قیام کرنا اور وہاں آباد ہونا شرعی طور پر کیسا ہے؟ مسلم ملکوں کے ان مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ کافی اہمیت کا حامل ہے، جو اپنا وطن چھوڑ کر غیر مسلم ملکوں میں منتقل ہو چکے ہیں، اور دوبارہ لوٹنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ کیا اسلامی نظام چھوڑ کر غیر اسلامی نظام میں پناہ ڈھونڈھنا اور مسلم حکمرانوں کے دائرہ اطاعت سے نکل کر غیر مسلم حکمرانوں کی بالا دستی قبول کرنا جائز ہے؟

یہ سوال انتہائی قدیم ہے۔ ائمہ اربعہ کے دور میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے، البتہ حالات کے فرق سے اب مسئلہ کی وہ حساسیت باقی نہیں رہی، جو پہلے سمجھی جاتی تھی۔

مسئلہ کی دو بنیادیں:

اس مسئلہ کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لیے دو بنیادوں پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

(۱) جس غیر مسلم ملک میں کوئی مسلمان قیام پذیر ہے یا قیام کرنا چاہتا ہے قانونی اور سیاسی طور پر ایک مومن کے لیے وہاں کی صورتِ حال کیا ہے؟ صورتِ حال کے فرق سے حکم میں فرق آئے گا۔

(۲) وہاں قیام کا سبب اور محرک کیا ہے؟ سبب کے اختلاف اور محرکات کے فرق سے بھی حکم میں فرق پیدا ہوگا۔

غیر مسلم ملکوں کی قسمیں:

فقہاء نے سب سے زیادہ جس چیز کو اہمیت دی ہے، وہ پہلی بات ہے، فقہاء نے غیر مسلم ملکوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور ان تینوں کے جداگانہ احکام بیان کیے ہیں، کتبِ فقہ میں اس سلسلے میں بڑی تفصیل ملتی ہے، ہم یہاں اس ذیل میں ہونے والی بحثوں کا صرف خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) پہلی قسم ان غیر ممالک کی ہے جہاں بحیثیت مسلمان کسی شخص کا قیام سخت مشکل ہو، جہاں اپنے اور اپنی نسلوں کے دین وایمان یا جان ومال یا عزت وآبرو کو شدید خطرات درپیش ہوں، دین وایمان اور نسلوں کے تحفظ کی کوئی ضمانت وہاں موجود نہ ہو۔ مذہبی آزادی نہ ہو، دین پر قائم رہ کر وہاں رہنا ممکن نہ ہو، جو عہد اول میں ہجرت مدینہ سے قبل کی صورت حال تھی، ایسے ملکوں میں جانا یا وہاں قیام کرنا باتفاق فقہاء کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں، بلکہ جو لوگ وہاں پہلے سے آباد ہوں اور وہ کسی مسلم یا پرامن ملک کی طرف ہجرت کرنے کی قدرت رکھتے ہوں تو ان پر فرض ہے کہ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔

(حوالہ کے لیے درج ذیل کتابیں ملاحظہ فرمائیں، احکام القرآن للجصاص: ج۳ ص۲۲۸، مغنی المحتاج للشربینی ج۶ ص۵۴، الام للشافعی ج۲ ص۱۶۹، الحاوی الکبیر للماوردی ج۱۸ ص۳۱۱، روضۃ الطالبین للنووی ج۷ ص۴۷۴، کشاف القناع للبہوتی ج۳ ص۴۳، الانصاف للمرادوی ج۴ ص۱۲۱، البحر الذخان لابن المرتضیٰ ج۶ ص۲۶۶، نیل اوطار للشوکافی...... شرح النیل وشفاء العلیل لاطفیش ج۷ ص۵۵۱، المحلی لابن حزم ج۱۱ ص۲۰۰، المدونۃ الکبریٰ للامام مالک ج۵ ص۱۵۶۵، مقدمات ابن رشد مع المدونۃ الکبریٰ ج۹ ص۳۱۵۹)

البتہ شافعیہ نے اس حکم سے ان مسلمانوں کا استثناء کیا ہے جن کے وہاں قیام میں مسلمانوں کی کوئی مصلحت مضمر ہو اور ذاتی طور پر وہ لوگ ایمان کی حفاظت کے ساتھ غیر مسلموں

کی طرف سے پیش آنے والے خطرات اوراذیتوں کا مقابلہ کرسکتے ہوں، ایسے حضرات کے لیے مسلم ملکوں کے بجائے غیر مسلم ملکوں میں قیام کرنا نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہے۔

(مغنی المحتاج للشربینی ج۶ص۵۴/۵۴، الحاوی للماوردی ج۱۸ص۱۱۱/، تحفة المحتاج للھیثمی ج۴ص۲۱۱)

اس کا مأخذ دراصل یہ آیت کریمہ ہے۔

ان الذین توفاھم الملائکة ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللّٰہ واسعة فتھاجروا فیھا فاولئک ماواھم جھنم وساء ت مصیرا (سورۂ نساء -۹۷)

ترجمہ : بےشک ان لوگوں کی جان جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کررکھا ہے(جب) فرشتہ قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے، وہ بولیں گے ہم اس ملک میں بےبس تھے، فرشتے کہیں گے کہ اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرجاتے؟ تو یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے''۔(ترجمہ، ماجدی)

اس آیت کریمہ میں ایسی سرزمین پر اقامت اختیار کرنے کو ظلم اور بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے جہاں انسان اپنے دین وایمان کی حفاظت نہ کرسکے، بشرطیکہ انسان وہاں سے نکلنے اور کسی مناسب مقام پر قیام کرنے کی قدرت رکھتا ہو، (الکشاف للزمخشری ج۱ص۵۵۵)

پھر ایسے ملک میں جانے اور قیام کرنے کا کیا جواز ہوسکتا ہے۔

(۲) دوسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے، جہاں کھل کر دین پر عمل کرنے کی آزادی نہ ہو، مسلمان وہاں کمزور اقلیت کی زندگی گذار رہے ہوں، جہاں جان ومال اور عزت وآبرو پہ خطرات کے بادل منڈلاتے رہتے ہوں، مگر مسلمانوں کے لیے کوئی دوسری جائے ہجرت نہ ہو، یا ہجرت کے اخراجات کے متحمل نہ ہوں، اوراس طرح وہ وہاں رہنے پر مجبور ہوں، ایسے مسلمانوں پر باتفاق فقہاء ہجرت واجب نہیں ہے۔اوران ملکوں میں اقامت ان کے لیے باعث گناہ نہیں ہے۔

(احکام القرآن للجصاص ج۳ص۲۲۸، فتح العلی المالک لوملیش ج۷ص۳۷۵-۳۷۶، مغنی المحتاج للشربینی ج۴ص۳۳۹، الحاوی الکبیر للماوردی ج۱۸ص۱۱۱، کشاف اتقناع للبھوتی ج۳ص۴۴، المحلی لابن حزم ج۱۱ص۲۰۰، البحر الزخار لابن المرتضیٰ ج۶ص۴۶۹، شرح الازھار لابن المفتاح ج۴ص۵۷۵)

اس حکم کا مأخذ بھی مذکورہ بالا آیت کریمہ کا اگلا ٹکڑا ہے۔

الا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لايستطيعون حيلة ولايهتدون سبيلا واولئک عسى الله ان يعفوعنهم وكان الله عفوا غفورا

(النساء :۹۸-۹۹)

ترجمہ : بجز ان لوگوں کے جو مردوں اور عورتوں اور بچوں میں سے کمزور ہوں (کہ) نہ کوئی تدبیر ہی کر سکتے ہوں، اور نہ کوئی راہ پاتے ہوں، تو یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے گا اور اللہ تو ہے ہی بڑا معاف کرنے والا، بڑا بخشنے والا۔ (ترجمہ، ماجدی)

اس آیت میں کمزور اور مجبور لوگوں کو حکم ہجرت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، مگر یہ حکم اس وقت ہے جب تک ان کے لیے ہجرت کی کوئی سبیل نہیں بن جاتی۔

(۳) تیسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے، جہاں مسلمانوں کے لیے بحیثیت ایک اقلیت کوئی خطرہ نہ ہو، مذہبی آزادی حاصل ہو، اپنے یا اپنی نسلوں کے دین و ایمان کو مکمل تحفظ فراہم ہو، ایسے ملکوں میں اقامت اختیار کرنے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

(۱) ایک رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایسے ملکوں میں جانا یا رہنا بھی جائز نہیں۔ اگر قدرت میسر ہو تو مقیم مسلمانوں کے لیے وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے، یہ رائے فقہاء مالکیہ کی ہے، اور شافعیہ کا ایک قول بھی اسی کے مطابق ملتا ہے۔ (المدونة الكبرى للامام مالک ج۵ ص۱۵۶۵، مقدمات ابن رشد مع المدونة الكبرى ج۹ص۳۱۵۹)

مالکیہ کے نزدیک علی الاطلاق غیر اسلامی ملکوں میں قیام کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہاں

دین پر عمل کرنے کی قدرت میسر ہو یا نہ ہو۔

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ ایسے ملکوں میں قیام کرنا درست ہے، اور مقیم مسلمانوں کے لیے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں، یہ رائے حنفیہ اور حنابلہ کی ہے، اور شافعیہ کا صحیح مسلک بھی یہی ہے۔

(احکام القرآن للجصاص ج۲ص۳۰۵/، اعلاء السنن للتھانوی ج۱۲ص۳۶۱/، کشاف اتقناع للبھوتی ج۳ص۴۴ فتاوی ابن تیمیہ ج۴ص۲۸۰/، روضة الطالبین للنووی ج۷ص۴۷۴/، مغنی المحتاج للشربینی ج۶ص۵۴)

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جو فقہاء ان ملکوں میں قیام کو جائز قرار نہیں دیتے ان کے پیش نظر درج ذیل بنیادیں ہیں، (۱) حضرت معاویہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتنقطع الهجرة حتی تنقطع التوبة ولاتنقطع التوبة حتی تطلع الشمس من مغربها (ابوداؤد کتاب الجهاد ،باب فی الهجرة هل انقطعت حدیث(۲۴۶۲)،الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد بن حنبل ج۲۰ص۲۹۶)

ترجمہ: ہجرت اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک کہ توبہ کا دوازہ بند نہ ہو، اور توبہ کا دروازہ اس وقت تک بند نہ ہوگا جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو جائے۔

حضرت عبداللہ السعدیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

لاتنقطع الهجرة ماقوتل الکفار وفی روایة ،لا تنقطع الهجرة مادام العدو یقاتل.

(السنن الکبری للبیهقی ،کتاب السیر باب الرخصة فی الاقامة بدارالشرک لمن لا یخاف الفتنه ج۹ص۱۸/،الفتح الربانی لترتیب مسند امام احمد بن حنبل ج۲۰ص۲۹۵/، نسائی، کتاب البیعة ،باب ذکر الاختلاف فی انقطاع الهجرة ،رقم"۴۱۸۳-۴۱۸۴)

ترجمہ: ہجرت اس وقت تک بند نہ ہوگی جب تک کفار سے جہاد کا سلسلہ جاری ہے،

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا عمل تا قیام قیامت جاری رہے گا، اور ظاہر ہے کہ اس حکم کے مخاطب غیر اسلامی ملکوں کے مقیم مسلمان ہی ہیں، اس لیے ان تمام پر لازم ہے وہ کسی بھی غیر اسلامی ملک میں اقامت اختیار نہ کریں، اور فریضۂ ہجرت پر عمل کرتے ہوئے، غیر اسلامی ملکوں سے نقل مکانی کرلیں، اس سے قدرتی طور پر یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ جب غیر اسلامی ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو ان ملکوں کو چھوڑ دینے کا حکم دیا جارہا ہے، تو مسلم ملکوں سے منتقل ہوکر وہاں جانے کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟

ان روایات پر سند اور استدلال دونوں لحاظ سے کلام کیا گیا ہے، حضرت معاویہ کی روایت سند کے اعتبار سے متکلم فیہ ہے۔

(عون المعبود لشمس الحق عظیم آبادی ج۷ص۱۵۶، نیل الاوطار للشوکانی ج۸ص۲۶)

اس روایت کی سند میں ایک راوی ابوہند البجلی ہیں ان کو ابن القطان نے مجہول قرار دیا ہے، (تہذیب التہذیب ج۱۰ص۲۹۹)

ایک دوسرے راوی عبدالرحمٰن بن ابی عوف کو بھی ابن القطان نے مجہول کہا ہے۔

(تہذیب التہذیب لابن حجر ج۵ص۱۵۴)

اسی طرح عبداللہ السعدی کی روایت میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش کو بعض محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، امام نسائی نے ان کو ضعیف کہا، ابن حبان نے کہا کہ حدیث میں بہت غلطیاں کرتے ہیں، اس طرح بقول محدث ابن خزیمہؒ روایت قابل استدلال نہیں رہی۔

(میزان الاعتدال للذہبی ج۱ص۲۴۱-۲۴۴)

اور اگر روایات صحیح اور لائق استدلال بھی ہوں تو بھی ان کا محمل وہ ممالک بن سکتے ہیں، جہاں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہیں، جہاں دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کو شدید خطرات لاحق ہوں، مسلمان وہاں سے ہجرت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، اور کسی اسلامی ملک نے ان کے لیے اپنے دروازے کھول دیئے ہوں، ان احادیث کو علی الاطلاق تمام غیر اسلامی ملکوں پر منطبق نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ غیر اسلامی ملکوں میں قیام کی اجازت کی

روایات بھی موجود ہیں۔

(سبل السلام للصنعاني ج۴ص۸۶/، تحفة الاحوذی للمبارکفوری ج۵ص۲۱۵)

دوسرا استدلال:

دوسرا استدلال ان روایات سے کیا گیا ہے، جن میں مشرکین کی آبادیوں کے درمیان مسلمانوں کو اقامت کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت جریر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انا بریئ من کل مسلم یقیم بین اظهر المشرکین قالوا یارسول اللّٰہ ولم ؟قال لاتراء ی نا راهما.

(ترمذی کتاب السیر ،باب ماجاء فی کرهیة المقام بین اظهر المشرکین، حدیث ۱۶۵۴/، ابوداؤد، کتاب الجهاد ،باب النهی عن القتل من اعتصم بالسجود حدیث ۲۶۲۸/، نسائی ،کتاب القسامة ،باب القود بغیر حدید مرسل ،حدیث۴۷۹)

ترجمه: میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو، لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیوں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا دونوں اتنی دور رہیں کہ ان میں سے کوئی دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکے۔

حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتساکنوا المشرکین ولاتجامعوهم فمن ساکنهم اوجامعهم فهو مثلهم.

(السنن الکبری للبیهقی ، کتاب السیر ،باب الرخصة فی الاقامة بدارالشرک لمن لایخاف الفتنةج۹ص۱۸/،جامع الترمذی مع شرح تحفة الاحوذی ج۵ص۲۳۰)

وفی روایة: من جامع المشرک وسکن معه فانه مثله.

(ابوداؤد ،کتاب الجهاد ،باب فی الاقامة بارض الشرک ،حدیث۲۷۷)

ترجمه: مشرکوں کے ساتھ نہ رہو اور نہ ان کے ساتھ اکٹھے ہو، جو ان کے ساتھ

رہے گا یا اکٹھے ہوگا وہ انہی کی طرح سمجھا جائے گا‘‘۔

ان روایات سے صراحۃ غیر مسلموں کے درمیان سکونت کی حرمت ثابت ہوتی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ یہ روایات بھی کلام سے خالی نہیں ہیں، مثلاً حضرت جریر بن عبداللہ کی حدیث مرسل ہے یا متصل؟ اس میں محدثین کے درمیان اختلاف ہوا ہے، اورامام بخاری، امام ترمذی اور امام ابوداؤد وغیرہ نے اس کے ارسال والی بات کو ترجیح دی ہے، (تحفۃ الاحوذی شرح الترمذی ج۵ ص۲۳۰)

دوسرے اس کی سند میں ایک راوی ابومعاویہ الضریر ہیں، ان کا نام محمد بن خازم التمیمی ہے، ابن خراش اور عبداللہ بن احمد کی رائے ان کے بارے میں یہ ہے کہ وہ صرف اعمش کی روایات کی حد تک قابل اعتبار ہیں، باقی روایات میں ان کے حافظہ پر اعتماد نہیں ہے۔

(میزان الاعتدال للذہبی ج۴ ص۵۷۵، تہذیب التہذیب لابن حجر ج۷ ص۱۲۷)

رہی حضرت سمرۃ بن جندب والی روایت تو اس کے دونوں طرق ضعیف ہیں، پہلے طریق کی سند میں ایک راوی اسحاق بن ادریس ہیں جن کو متعدد محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، بلکہ یحیی بن معین نے ان کو کذاب اور حدیث گھڑنے والا کہا ہے، دارقطنی نے ان کو منکر الحدیث، اورنسائی نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔

(میزان الاعتدال للذہبی ج۱ ص۱۸۴، المجموع فی الضعفاء والمتروکین لعبدالعزیز السیروان ص۲۸۳)

دوسرے طریق کی سند کے بارے میں ذہبی کا خیال ہے کہ لائق استدلال نہیں ہے۔

(نیل الاوطار للشوکانی ج۸ ص۲۵)

اس لیے کہ سند میں ایک راوی سلیمان بن موسی ابوداؤد متکلم فیہ راوی ہیں، ان کے بارے میں نسائی کہتے ہیں کہ حدیث میں مضبوط نہیں ہیں، ابن حجر کہتے ہیں کہ ’’فیہ لین‘‘ ان میں کچھ نرمی ہے، بخاری کہتے ہیں ’’لہ مناکیر‘‘ کہ یہ منکر روایات بھی نقل کرتے ہیں۔

(عون المعبود شمس الحق عظیم آبادی ج۷ ص۴۷۷، المجموع فی الضعفاء والمتروکین ص۱۱۶-۴۴۲)

اوراگر یہ روایات درست بھی ہوں تو بھی ان کا اطلاق عموم کے ساتھ غیر اسلامی ملکوں پر نہیں ہوسکتا، بلکہ ان کا مصداق صرف وہ ممالک قرار دیئے جائیں گے جہاں مسلمان کے لیے دین پر آزادانہ عمل کی راہ میں مشکلات ہوں، اور ہجرت کے سوا اسلامی زندگی گذارنے کی کوئی صورت موجود نہ ہو، ....اور اگر اس روایت کواس کے پس منظر کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بات بہت زیادہ صاف ہوجاتی ہے، یہ حدیث جس پس منظر میں رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ یہ تھا کہ رسول ﷺ نے ایک سریہ قبیلۂ بنو خثعم کی طرف بھیجا تو کچھ لوگوں نے سجدوں کی ڈھال اختیار کر لی یعنی سجدے میں چلے گئے تاکہ مجاہدین ان کو مسلمان جان کر قتل نہ کریں، مگر مجاہدین کی تلوار سے وہ حضرات محفوظ نہ رہ سکے، جب کہ فی الواقع وہ مسلمان تھے، حضور اکرم ﷺ کو اس کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے ان کے لیے نصف دیت کا حکم جاری فرمایا، اور یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان رہائش پذیر ہو۔

(جامع الترمذی مع تحفة الاحوذی ج۵ص۲۲۹)

عقلی استدلال:

ایک عقلی دلیل یہ دی جاتی ہے۔ایک مسلمان کے غیر اسلامی ملک میں جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ کو اسلامی قوانین کے سایہ سے نکال کر غیر اسلامی قوانین کے لیے پیش کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ کسی صاحب ایمان کو اسکی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(مقدمات ابن رشد مع المدونة الکبری ج۹ص۳۱۵۹، المدونة الکبری للامام مالک ج۵ص۱۵۶۵)

مگر اس دلیل کی معنویت آج کے دور میں باقی نہیں رہی، اس لیے کہ تمام اقوام و ممالک نے اپنے اپنے دستور میں مذہبی آزادی کا اصول تسلیم کرلیا ہے، اور ہر ملک میں ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دی گئی ہے، اس لیے آج کے حالات میں کسی غیر اسلامی ملک کے زیر اثر زیادہ سے زیادہ جن مسائل میں کسی مسلمان کے متأثر ہونے کا امکان ہے وہ اقتصادی مسائل ہیں مگر ان کا بڑا حصہ قانون اسلامی سے متصادم نہیں ہے، بلکہ بڑی

حدتک اسلامی قوانین سے ہم آہنگ ہے۔

بلکہ آج کا تجربہ تو یہ ہے کہ غیر اسلامی ملکوں کے مسلمان جس صلابت اور شدت کے ساتھ دین پر قائم ہیں، اسلامی ملکوں کے بیشتر مسلمان اس معیار پر نہیں اترتے، وہ دین کو پوری محبت کے ساتھ سینہ سے لگائے ہوئے ہیں کہ کہیں یہ ہم سے چھوٹ نہ جائے، جب کہ اسلامی ملکوں کے اکثر مسلمان محض روایتی طور پر دین پر قائم ہیں۔

قائلین جواز کے دلائل:

جمہور فقہاء جواز کی رائے رکھتے ہیں، اوراس کے لیے ان کے پیش نظر بعض اہم بنیادیں ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز ارشاد فرمایا:

لاھجرة ولکن جھا دونیة واذااستُنفرتم فانفروا.

(بخاری، کتاب الجھاد، باب لاھجرة بعد الفتح ج۱ص۴۳۳، حدیث ۳۰۷۷/ المسلم، کتاب الامارة باب المبایعة بعد فتح مکة علی الاسلام والجھاد، حدیث۴۸۰۳)

ترجمہ: اب ہجرت کا حکم باقی نہیں البتہ جہاد اور نیت باقی ہے، جب تم کو جہاد کے لیے بلایا جائے تو جہاد کے لیے نکلو۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب پورے علاقۂ عرب میں امن قائم ہوگیا، اور مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی تو ہجرت مدینہ کا حکم منسوخ کردیا گیا، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم صرف مکہ مکرمہ ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر وہ علاقہ جہاں مسلمانوں کو ان کے اسلامی امور کی بجا آوری میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اس میں داخل ہے، (فتح الباری، شرح بخاری ج۶ص۲۳۳-۲۳۴)

علامہ خطابیؒ اور شوکانی کا بیان ہے کہ ابتداء اسلام میں چونکہ مسلمان تعداد میں کم اور منتشر تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ ان کو کسی ایک مقام پر جمع کیا جائے، اس وقتی مصلحت کے

پیش نظر ہجرت مدینہ کا حکم عبوری طور پر دیا گیا، لیکن جب مسلمان تعداد میں بڑھ گئے اور ان کی قوت بھی کافی حد تک مستحکم ہوگئی، جس کا علامتی مظاہرہ فتح مکہ کی صورت میں ہوا، تو ہجرت مدینہ کا یہ حکم اٹھالیا گیا، (معالم السنن للخطابی ج۲ص۲۰۳، نیل الاوطار للشوکانی ج۸ص۲۶)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے قبل بعض صحابہ کو مکہ میں رہنے کی اجازت دی جب کہ مکہ فتح مکہ، سے قبل دارالکفر تھا، مثلاً اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کو حضور نے مکہ میں رہنے کی اجازت دی، اس لیے کہ ان کے بارے میں دینی فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔ اور ذاتی وجاہت اور خاندانی اثر ورسوخ کی بنا پر کفار ان کو جانی و مالی نقصانات بھی نہیں پہونچا سکتے تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دارالکفر میں اگر دین وایمان اور جان ومال کے تحفظ کا یقین ہو تو قیام کرنے کی اجازت ہے۔

(الام للشافعی ج۲ص۱۶۹، المغنی لابن قدامہ ج۱۰ص۵۵، السنن الکبری للبیہقی ج۹ص۱۵)

البتہ حضرت عباسؓ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہجرت کی قدرت نہیں رکھتے تھے، اس بنا پر حکم ہجرت سے ان کو مستثنی کردیا گیا تھا، جو عام مستضعفین کا حکم ہے۔

(۳) بعض صحابہ نے مکہ میں کفار کی اذیتوں سے مجبور ہوکر حبشہ کی عیسائی سلطنت کا رخ کیا اور وہیں مقیم ہوگئے، اور جب تک اللہ نے ہجرت مدینہ کی سبیل نہیں پیدا کی وہیں مقیم رہے، یہاں تک کہ بعض صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد بھی حبشہ ہی میں مقیم رہے، اور یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق ہوا۔

خود نجاشی مسلمان ہونے کے بعد اپنی غیر اسلامی سلطنت میں مقیم رہا، جب کہ وہ اپنے وسائل کی بدولت مدینہ ہجرت کرنے کی قدرت رکھتا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے وہ حبشہ میں مقیم رہا، اور جب اس کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی اور فرمایا:

مات الیوم رجل صالح.

(صحیح البخاری شرح فتح الباری ج۷ص۲۴۲، کتاب مناقب الانصار، باب موت

النجاشی،حدیث ۳۸۷۷)

ترجمہ: آج ایک صالح شخص کا انتقال ہو گیا ہے۔

(۴) مشہور تابعی حضرت عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ میں نے عبید بن عمیر کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی ،اور ان سے ہجرت کے بارے میں سوال کیا،تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

''اب ہجرت کا حکم نہیں ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کا حکم اس وقت تھا جب مسلمانوں کے لیے دینی اعتبار سے فتنہ کا اندیشہ تھا،اس لیے مسلمان مختلف علاقوں سے سمٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ مجتمع ہو گئے ،لیکن اب اللہ نے اسلام کو فروغ دے دیا ہے اس لیے اب جو شخص جہاں چاہے رہ کر اپنے پروردگار کی عبادت کرے،البتہ جہاد اور نیت کا حکم اب بھی باقی ہے''۔

(صحیح بخاری شرح فتح الباری ج۷ص۲۸۶، السنن الکبری للبیہقی ،کتاب السیر، باب الرخصۃ فی الاقامۃ بدار الشرک لمن لا یخاف الفتنۃج۹ص۱۷)

حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا اشارہ اس جانب ہے کہ ہجرت کا حکم مطلق نہیں ہے، بلکہ فتنہ کی علت کے ساتھ مربوط ہے،علت موجود ہوگی تو حکم پایا جائے گا،علت نہیں رہے گی تو حکم بھی باقی نہ رہے گا،اس طرح وہ ممالک جہاں دینی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے فتنہ نہ ہو وہاں اقامت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے،اور وہاں مقیم مسلمانوں کے لیے ہجرت واجب نہیں،(فتح الباری لابن حجرؒ ج۷ص۲۹۰)

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں،اگر کسی غیر اسلامی ملک میں آزادانہ طور پر دین پر عمل کرنے کی قدرت ہو تو وہ دارالاسلام کے حکم میں ہے،اور دارالاسلام کے مقابلے میں مسلمانوں کا وہاں قیام کرنا زیادہ باعث فضیلت ہے،اس لیے کہ اس میں اسلام کی دعوت واشاعت کے امکانات زیادہ ہیں،(الحاوی للماوردی ج۱۸ص۱۱۱)

قول راجح: غور کرنے سے جمہور کا موقف ہی زیادہ مضبوط معلوم پڑتا ہے،اور اس

کے کئی اسباب ہیں:

(۱) عدم جواز کے لیے جو روایات پیش کی گئی ہیں ، وہ عموما طعن سے خالی نہیں ہیں، اور اگر ان کو بھی تسلیم کرلیا جائے تو ان کا محل وہ ممالک قرار پا سکتے ہیں جہاں مسلمانوں کے لیے دینی لحاظ سے خطرہ درپیش ہو، اور فقہ کا ضابطہ ہے کہ جب کسی دلیل میں دوسرا احتمال پیدا ہوجائے تو وہ کسی ایک معنی کے لیے متعین نہیں رہ جاتے ، اور اس سے استدلال باطل ہوجاتا ہے۔

(۲) نیز غیر اسلامی ممالک کی صورت اب قطعا مختلف ہوگئی ہے، آج ان ممالک میں فکر وعقیدہ اور اظہار خیال کی جو آزادی ہے، اللہ مجھے معاف کرے ، وہ بہت سے اسلامی ملکوں میں بھی میسر نہیں ہے ، آج وہاں اسلامی ادارے، مساجد ، مدارس اور دینی تحریکات وتنظیمات کی خاصی تعداد خدمت دین میں مصروف ہیں، اور ان کے لیے کوئی سیاسی یا قانونی رکاوٹ نہیں ہے، بڑے بڑے اہل علم، اور اہل تحقیق موجود ہیں جو مختلف ممالک سے مختلف اسباب کے تحت وہاں پہونچ گئے ہیں، اس لیے آج ان ممالک میں نہ اسلام کے لیے خطرہ ہے اور نہ مسلمانوں کے لیے ، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان ممالک میں مقیم مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا جائے ، یا مسلمانوں کے وہاں داخلہ یا اقامت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

(۳) اور اگر اس نظریہ کو تسلیم کرلیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ تمام غیر اسلامی ممالک کو اسلام اور مسلمانوں کے وجود سے خالی کردیا جائے، اس طرح کی بات کم از کم آج کے دور میں کوئی دانشمند شخص نہیں کرسکتا، علاوہ ازیں تمام مقیم مسلمانوں کی ہجرت اور نقل مکانی میں آج کے دور میں جو مشکلات اور دشواریاں ہیں وہ اپنی جگہ ہیں، یہ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

وماجعل علیکم فی الدین من حرج (سورۂ حج:۷۸)

ترجمہ: اللہ نے تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔

یرید الله بکم الیسر ولایرید بکم العسر۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتے ہیں، مشکل نہیں چاہتے۔

غیر مسلم ملکوں میں قیام کے محرکات:

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ غیر اسلامی ممالک میں قیام کے محرکات کیا ہیں؟ محرکات کے فرق سے بھی حکم میں فرق پیدا ہوتا ہے۔

مختلف اغراض ہیں جن کے تحت لوگ غیر اسلامی ملکوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔

سیاسی پناہ کا حصول:

(۱) کبھی کسی مسلمان کو اپنے ہی ملک میں اس کی جان ومال یا عزت وآبرو کو خطرہ درپیش ہوتا ہے، اور دار الاسلام ہونے کے باوجود اس کے ساتھ حق تلفی اور زیادتی روا رکھی جاتی ہے، ایسے حالات میں انسان اپنی سہولت ومصلحت کے لحاظ سے کسی غیر اسلامی ملک کا رخ کرتا ہے، تاکہ وہ اپنی جان ومال کا تحفظ کر سکے، اور پر امن اور خوشحال زندگی گذار سکے، اس صورت میں اس کے لیے غیر اسلامی ملک میں قیام کرنے کی اجازت ہے، البتہ اس کے لیے درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(الف) ایسے ملک کا انتخاب کرے جہاں پوری آزادی کے ساتھ وہ دین پر عمل کر سکتا ہو،

(ب) اسلامی ملک میں اس کے ساتھ ظلم وجبر آخری حد تک پہونچ گیا ہو، اور اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ ہو، اور کوئی مسلم فرد یا ملک اس کی نصرت وحمایت کے لیے آمادہ نہ ہو،

(ج) غیر مسلموں کے کسی ایسے عمل میں تعاون نہ کرے جو عام مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ہو، (الجامع الاحکام القرآن للقرطبی ج۵ ص۳۵۰، احکام القرآن لابن العربی ج۱ ص۴۸۵، المحلی لابن حزم ج۱۱ ص۲۰۰)

اس سلسلے میں رسول اکرم ﷺ کے اس فرمان سے بھی رہنمائی ملتی ہے کہ......... من فر بدینه من ارض الی ارض وان کان شبوا من الارض استوجبت له الجنة.

ترجمہ: جو شخص اپنے دین کے لیے ایک زمین سے بھاگ کر دوسری زمین کی طرف منتقل ہو چاہے اس کی خاطر اس کو صرف ایک بالشت زمین ہی چھوڑنی پڑے، اس کے لیے

جنت واجب ہوگئی، (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج۵ص۳۴۷)

اسی طرح ولید بن یزید نے ہشام بن عبدالملک کے بارے میں امام زہری کو دھمکی دی اوران کے خون کی نذر مانی (یعنی ہشام کے مرنے کے بعد تمہاری جان لوں گا) حضرت زہری نے خوف سے عزم مصمم کرلیا کہ ہشام کی موت کے بعد روم چلے جائیں گے، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور خود زہری کی وفات ہشام سے قبل ہوگئی، (المحلی لابن حزم ج۱۱ص۲۰۰)

مسلمانوں سے جنگ کا ارادہ:

اگر کوئی شخص بلاضرورت محض غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات کی بنا پر ان کے ملک چلا جائے، اوران کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف کسی عمل میں شریک ہو، ایسی حالت میں غیر مسلم ملک جانا یا قیام کرنا حرام ہے، (المحلی لابن حزم ج۱۱ص۲۰۰)

اوراس کی ممانعت صراحت کے ساتھ قرآن کریم میں آئی ہے۔

یاایھاالذین آمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاری اولیاء بعضھم اولیاء بعض و من یتولھم منکم فانه منھم (سورۂ مائدہ:۵۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ ان میں بعض بعض کے دوست ہیں جو ان کے ساتھ دوستی کرے گا اس کا شمار انہی کے ساتھ ہوگا''۔

تجارت یا کسی عمل کے لیے قیام:

بھی کسی تجارت یا عمل کے لیے غیر مسلم ملک جانے یا وہاں رہنے کی ضرورت پڑتی ہے، مگر اس کی کئی شکلیں ہیں۔

(الف) اپنے ملک میں معاش کے بنیادی وسائل میسر نہ ہوں اوراسکی بنا پر مجبورا کوئی مسلمان غیر مسلم ملک چلاجائے اور وہاں اقامت کرے، تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے، (المبسوط للسرخسی ج۱۰ص۸۸، احکام القرآن لابن العربی ج۱ص۵۱۵، الجامع لاحکام القرآن ج۵ص۳۵۱/ کشاف اقتناع للبھوتی ج۳ص۱۳۱)

اوراس حکم کا مأخذ یہ آیت کریمہ ہے۔

ھو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبھا و کلوا من رزقه والیه النشور .

ترجمہ : وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع بنایا پس ان کے کاندھوں پر چلواور اسکی دی ہوئی رزق استعمال کرواور اسی کی طرف پھر اٹھایا جانا ہے‘‘ (سورۃ ملک:۱۵)

ظاہر ہے کہ زمین میں حصول رزق کے لیے سفر کا حکم کسی زمین و مکان کے ساتھ مقید نہیں ہے۔

(ب) بنیادی وسائل معاش اپنے ملک میں میسر ہوں جس سے فاقہ کی نوبت تو نہ آتی ہو، مگر اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی پوزیشن بہتر کرنے کے لیے کسی غیر مسلم ملک میں قیام کیا جائے، تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

(احکام القرآن لابن العربی ج ا ص ۴۸۶، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۵ ص ۳۵۱)

قرآن پاک کی ایک آیت کریمہ سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

لیس علیکم حرج ان تبتغوا فضلا من ربکم (سورہ بقرہ: ۱۹۸)

ترجمہ: کوئی مضائقہ نہیں اس بات میں کہ تم اپنے رب کی دی ہوئی رزق تلاش کرو۔

(ج) تجارتی مقاصد کے تحت غیر اسلامی ملکوں میں قیام کیا جائے جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔ (المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۸۸)

البتہ امام مالک اور علامہ ابن حزم کو اس سے اختلاف ہے ان کے نزدیک دنیوی اغراض کے لیے غیر اسلامی ملک میں قیام جائز نہیں ہے۔

(مقدمات ابن رشد ج ۹ ص ۳۱۵۹، المحلی لابن حزم ج ۱۱ ص ۳۴۹)

دراصل جمہور فقہاء کے پیش نظر عہد نبوی کے بعض واقعات ہیں جن میں بعض صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے تجارتی اغراض کے تحت غیر مسلم ملکوں کا سفر کیا اور حضور ﷺ نے نکیر نہیں فرمائی۔ (الولاء والبراء فی الاسلام، الشیخ محمد القحطانی ۷۹)

بالخصوص آج کے دور میں مسلم ممالک تجارت وصنعت کے میدان میں جس قدر پسماندہ ہیں ان کا تقاضا ہے کہ مسلم تجار ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں کا دورہ کریں یا وہاں قیام کریں،

اوراعلیٰ صنعت سے روشناس کرائیں۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تجارت اگر پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق کیا جائے تو غیر مسلم برادری پر اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھا اثر پڑے گا اوراس سے دعوت کی راہ کھلنے کے بڑے امکانات ہیں، ماضی میں تجارت ہی کے عنوان سے ہمارے اسلامی قافلوں نے مختلف ملکوں کا سفر کیا اور انہی قافلوں کے ذریعے اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پہونچا، اس لیے تجارت آج کے دور میں دعوت کا بہترین وسیلہ ہے، اوراس وسیلہ کو کھودینا ہرگز دانشمندی نہیں ہوگی''۔

(د) غیر اسلامی ملکوں میں اس لیے قیام کیا جائے کہ اس کے فن یا عمل کے تقاضوں کی تکمیل وہاں ہوتی ہو، مثلاً کوئی کسی اسلامی ریاست کی طرف سے مخصوص عمل کے لیے غیر اسلامی ملک ہی میں مبعوث ہو، یا اخباری نمائندہ کے طور پر اس کو وہاں جانا پڑے اور قیام کرنا پڑے وغیرہ، تو ایسی صورت میں بھی وہاں قیام کرنا جائز ہوگا، البتہ ان حالات میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) اس کام سے کوئی مصلحت وابستہ ہو، اوراس سے عام مسلمانوں کو نقصان نہ پہونچتا ہو۔

(۲) خلاف شرع کام نہ ہو، اور طریق کار بھی اسلامی احکام سے متصادم نہ ہو۔

(۳) ملک ایسا ہو جہاں دینی شعائر واحکام پر عمل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہو اوراس سلسلے میں قانونی، سیاسی یا سماجی طور پر کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔

(فتاوی الامام عبدالحلیم محمود ج۲ص۲۷۴ر، ڈاکٹر احمد جمال ج۱ص۲۴۰)

تحصیل علم کے لیے وقتی قیام:

آج علم نے بہت سی شکلیں اختیار کرلی اور نئے نئے علوم وجود میں آگئے ہیں، بالخصوص صنعت اور طب کے میدان میں، مسلمان کے لیے ان سے واقف ہونا اوران کے راستے سے غیر مسلموں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تک رسائی حاصل کرنا، اوران علوم کو نیک مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سلیقہ سیکھنا بے حد ضروری ہے، آج مغربی قوموں نے اسی علمی برتری کی بدولت

ساری دنیا پر اپنا سکہ جمالیا ہے، اور کوئی قوم نہیں جو ان کی اس علمی بالادستی کو چیلنج کر سکے، مسلمان اہل علم کے لیے آج ضروری ہے کہ وہ مغربی اقوام سے یہ علوم سیکھیں اور وسائل و اسباب کی دنیا میں اپنا مقام بنائیں، اور جو علوم آج مادی اور سطحی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہے ہیں ان کو معنوی اور اعلی مقاصد کے لیے استعمال کریں۔

اسلام تو پہلا مکتب تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے معلم انسانیت ہیں، جنہوں نے سب سے زیادہ علم کی اہمیت پر زور دیا، اور اس کو ہر طرح فروغ دینے کی تدبیریں کیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم کے سفر کی اہمیت بھی بیان فرمائی، ارشاد فرمایا:

من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع.

(ترمذی کتاب العلم باب فضل طلب العلم، حدیث ۲۷۸۵، قال ھذا حدیث غریب)

ترجمہ: جو شخص علم کی جستجو میں نکلے وہ اللہ کے راستے میں ہے جب تک کہ لوٹ نہ جائے۔

علم سے مراد علم نافع ہے، اور علم دین اس کا اولین مصداق ہے، لیکن ثانوی مصداق اس کا دنیا کا ہر وہ علم ہے جو جائز بنیادوں پر قائم ہو، جس سے انسانیت کی فلاح وابستہ ہو، اور جس کو کسی نہ کسی درجہ میں اسلام اور امت مسلمہ کے تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو، موجودہ عصری تقاضوں اور عالم اسلام کی پسماندگی اور ناخواندگی کے پیش نظر خیال یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کی غرض سے غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کا قیام نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہونا چاہئے۔

البتہ اس میں چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔

(۱) جن علوم کو حاصل کرنے کے لیے غیر مسلم ملک کے سفر کا ارادہ ہو امت مسلمہ کو فی الواقع ان علوم کی ضرورت ہو۔

(۲) وہ علوم نصوص شرعی اور اسلام کے قواعد عامہ کے خلاف نہ ہوں۔

(۳) وہاں طلبہ کی دینی وفکری تعلیم کا معقول انتظام موجود ہو۔

دعوت الی اللہ کے لیے سفر و اقامت:

اگر غیر مسلم ملکوں کا سفر یا وہاں قیام دعوت الی اللہ کی غرض سے کیا جائے تو اس کے جواز یا استحباب میں کیا کلام ہوسکتا ہے، آج ساری دنیا میں اسلام اسی طرح پھیلا ہے، ہمارے بزرگوں نے اسی طرح اپنا وطن چھوڑا غیر مسلم ملکوں میں جا کر اقامت اختیار کی اور اپنے قول و عمل اور اخلاقی قوت کے ذریعہ اسلام کا کلمہ دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچایا۔

دنیا کی تمام اقوام تک دعوت پہونچانا اس امت پر فرض کفایہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے،.........**فلولا تفر من کل فرقة طائفة یتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون** (سورۃ توبہ:۱۲۲)

ترجمہ: سو یہ کیوں نہ ہو کہ ان میں ایک حصہ نکل کھڑا ہوتا کہ (یہ باقی لوگ) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں، تاکہ یہ اپنی قوم والوں کو جب وہ ان کے پاس واپس آئیں تو ڈرائیں، عجب کیا کہ وہ محتاط رہیں۔

اس لحاظ سے امت کے ایک طبقہ کا قیام غیر مسلم ملکوں میں ضروری ہے، جو دعوتی مقاصد کے تحت وہاں مقیم ہو، اور اسلامی تعلیمات ان تک پہونچائے۔

طبی اغراض کے تحت قیام:

اگر کسی مرض کا مناسب علاج مسلم ملک میں میسر نہ ہو تو اس کے لیے غیر مسلم ملک کا سفر کرنا اور صحت کے لیے وہاں قیام کرنا جائز ہے۔

(فتاوی ورسائل للمسافرین علماء کی ایک جماعت ص ۳۹)

سیر و سیاحت اور تفریح طبع کے لیے قیام:

سیر و سیاحت، تفریح طبع مسلم بھائیوں سے ملاقات کی غرض سے بھی غیر اسلامی ملک کا سفر کرنا یا وہاں قیام کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے۔

(احکام القرآن لابن العربی ج۱ص۴۸۶، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج۵ ص۳۵۰، الاقلیات المسلمه، الشیخ محمد العیتمین وابن باز۶۷)

اس لیے کہ سیر و سیاحت بذات خود ناجائز نہیں ہے، بلکہ عبرت و موعظت کی غرض سے

شرعاً محمود و مطلوب ہے، اور اس سے اللہ کی قدرت و حکمت کے بے شمار مظاہر سامنے آتے ہیں، جن سے انسان کے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے، دنیا کی بے ثباتی کا تجربہ ہوتا ہے، اور بسا اوقات سفر سے انسان بہت سے روحانی اور احسانی مدارج و مقامات طے کر لیتا ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا۔

قل سیرو ا فی الارض فانظر و ا کیف بدأ الخلق(عنکبوت:۲۰)

ترجمہ : آپ کہدیں کہ زمین کا سفر کرو، پھر دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا؟

اور اس سیر سیاحت کے عموم میں غیر مسلم ممالک بھی داخل ہیں، اس لیے کہ زمین ساری اللہ کی ہے، جس کو چاہتا ہے اپنی زمین کا وارث بنا دیتا ہے،..........البتہ سیر و سیاحت کی غرض سے غیر مسلم ممالک جانے والوں کو درج ذیل امور کی رعایت کرنا ضروری ہے۔

(۱) ایسے دائروں اور علاقوں میں جایا جائے جہاں شرعی طور پر دانستہ یا نادانستہ ناجائز امور کا ارتکاب نہ کرنا پڑے۔

(۲) اسراف اور ضیاع وقت سے پرہیز کیا جائے۔

(۳) سیاحت کی غرض درست ہو مثلاً دعوت الی اللہ، مسلم بھائیوں کی ملاقات، کسی تعلیمی پروگرام میں شرکت یا مشاہدۂ آثار الٰہی وغیرہ مقاصد میں سے کوئی مقصد ہو۔

غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا

اس ذیل میں ایک اہم ترین بحث غیر مسلم ملک کی شہریت (NATIONALITY) کے حصول کی ہے، کہ آیا شرعی طور پر کسی اسلامی ریاست کے شہری کے لیے جائز ہے، کہ وہ کسی غیر مسلم ریاست میں جا کر وہاں کی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور وہاں کا شہری بن کر غیر اسلامی قانون کے زیر سایہ زندگی گذارے یہ کسی ملک میں قیام اور اقامت سے آگے کا مرحلہ ہے۔

شہریت کا مفہوم:

شہریت موجودہ قانون کی نگاہ میں فرد اور حکومت کے درمیان ایک مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر ایک دوسرے پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے، یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس حکومت کی طرف منسوب ہو جاتا ہے جہاں کا وہ شہری ہے مثلاً امریکی، ہندوستانی، برطانوی، سعودی وغیرہ۔ (الجنسیة فی الشریعة الاسلامیة لرحیل الرحیل ۱۳/، علوم الشریعہ والقانون عبداللہ الگیلانی ص ۱۵۲)

کیا کسی مسلمان کو یہ اجازت ہوگی، وہ کسی اسلامی ریاست سے اپنا وطنی انتساب ختم کر کے غیر مسلم ریاست کے ساتھ قائم کرے، کیا کسی حجازی کے لیے جائز ہوگا کہ وہ اپنے کو امریکی یا برطانوی کے طور پر متعارف کرائے۔

شہریت کی قسمیں:

شہریت بھی دو قسموں کی ہے، ایک پیدائشی شہریت ہے جو اس سرزمین میں جہاں بچہ کا باپ یا ماں (جیسا کہ اکثر یورپی ممالک کا حال ہے) رہتی ہے، پیدا ہونے والے بچہ کو خود بخود حاصل ہو جاتی ہے، اس میں اس بچہ کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔

دوسری قسم شہریت کی وہ ہے جو کوشش کر کے حاصل کی جائے، مثلا اس ملک کی کسی لڑکی سے شادی کر لی جائے، یا حکومت سے درخواست کر کے شہریت حاصل کی جائے۔

پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے، مثلاً ہندوستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرے، تو برطانوی شہریت حاصل ہوتے ہی ہندوستانی شہریت اس کی ختم ہوجائے گی، یعنی اب وہ ہندوستانی نہیں بلکہ خالص برطانوی کہلائے گا، ....اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد بھی سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے، مثلا پاکستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرے تو اسے دونوں جگہ کی شہریت برقرار رکھنے کا حق ہوگا، یعنی وہ بیک وقت پاکستانی بھی ہوگا، اور برطانوی بھی .... پاکستان میں پاکستانی رہے گا اور برطانیہ میں برطانوی یہ مختلف ملکوں کے اپنے اپنے معاہدات کی روشنی میں طے پاتا ہے، کہ کس ملک کے شہری کے ساتھ کیا معاملہ روا رکھا جائے؟

پھر جب کوئی شخص کسی غیر اسلامی ملک کا شہری بن جاتا ہے، تو اس کو وہ تمام حقوق ومراعات حاصل ہوجاتے ہیں جو ایک پیدائشی شہری کو حاصل ہوتے ہیں، تشکیل حکومت کے عمل میں شرکت کرسکتا ہے، اقتصادی مسابقت میں حصہ لے سکتا ہے، ملازمت حاصل کرسکتا ہے، زمین وجائداد خرید سکتا ہے اور تمام وہ ضمانتیں جو بحیثیت شہری کے ملنی چاہئے مل جاتی ہیں، یہاں تک کہ اس ملک سے جنگ کے وقت بھی جس کا وہ شہری تھا بین الاقوامی قانون کے مطابق یہ ملک اپنی سرزمین سے اس کو نکالنے کا اختیار نہیں رکھتا، اسی کے ساتھ اس پر بعض واجبات اور مطالبات بھی عائد ہوتے ہیں، جن کی تکمیل بحیثیت فرد اس کو کرنی پڑتی ہے، فوجی خدمات اس سے لی جاسکتی ہیں، ملک کے آئین کا احترام اور اس کی اطاعت لازم ہوجاتی ہے، مقرر ٹیکسوں کی ادائیگی کا وہ پابند ہوتا ہے۔ (الاحکام السیاسیة للاقلیات المسلمة ص۷۸-۷۹/ الحقوق والحریات السیاسیة ص۶۳-۶۴)

یہ ساری تفصیلات اس لیے ذکر کی گئیں تاکہ حکم شرعی سمجھنے میں آسانی ہو، یہ مسئلہ عہد جدید

کی پیدوار ہے اس لیے کہ سرحدوں کی تقسیم اور تحفظ اور ملکوں کی شہریت کی جو اہمیت آج ہے پہلے نہیں تھی، پہلے کسی ملک میں داخلہ یا وہاں قیام کرنے کے لیے کوئی ضابطہ مقرر نہیں تھا، بڑی آسانی سے لوگ ملکوں کا سفر کیا کرتے تھے اور جہاں موقعہ ملتا وہاں قیام کر لیتے تھے، شہریت کا جو تصور بالعموم آج کے بین الاقوامی قوانین کے تناظر میں پیدا ہوا ہے، پہلے نہیں تھا.........اس لیے یہ مسئلہ عصر حاضر میں علماء کے درمیان زیر بحث رہا ہے، ہمارے قدیم مراجع میں باضابطہ یہ بحث نہیں ملتی۔

دو نقطۂ نظر:

عصر حاضر میں اس موضوع پر علماء اور اہل قلم کی طرف سے جو مباحث پیش کئے گئے ہیں، ان کو پڑھنے سے علماء کے دو نقطۂ نظر سامنے آتے ہیں۔

(ا) ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے، اور ایسے تمام حضرات پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کا قائل ہے جو غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں۔

(فتاوی الامام محمد رشید رضا ج۵ ص۱۷۵۰،)

اس طبقہ کے مشہور نام عرب علماء میں یہ ہیں، شیخ محمد رشید رضا مصری، شیخ محمد یوسف الدجوی اور شیخ محمد شاکر، ۵/ازہر کے اکابر اہل علم ہیں، شیخ ادریس شریف محفوظؒ یہ اپنے وقت میں بیروت کے مفتی تھے، (حکم التجنس بحسنة دولة غير اسلاميه ص۱۷-۹۷)

اور ڈاکٹر محمد عبدالکریم الجزائری، (تبديل الجنسية ردة وخيانة ص۲۷)

(ب) دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے، اس طبقہ میں شیخ المختار السلامی، رکن مجمع الفقہ الاسلامی، (مجله الفقه الاسلامی ج۲ ص۱۱۵۶)

اور شیخ محمد عبداللہ بن سہیل امام وخطیب مسجد حرام، عضو هيئة كبار العلماء السعوديه قابل ذکر ہیں، (حکم التجنس بجنسة دولة غير اسلاميه ص۱۱۳)

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء.... نے بھی یہی فیصلہ جاری کیا ہے۔

(فتاوی اللجنة الدائمة للبحوث والافتاء ج۱۲ ص۵۸)

(۲) دوسری رائے جواز کی ہے، پھر جواز کے قائلین میں بھی دو نقطۂ نظر ہو گئے ہیں۔

(الف) ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بوقت ضرورت ہے۔

عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی مفتی عام سلطنت عمان اور رکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے، مصری دارالافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتوی دیا ہے، (فتوی نمبر ۸۸۹ / ۲۰۰۰ء)

(ب) دوسرا نقطۂ نظر اصلا جواز کا ہے، البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں فرق ہوسکتا ہے۔

عہد حاضر کے جمہور علماء کی رائے یہی ہے اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہ ہیں، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، (ویب سائٹ پر ان کا فتوی محفوظ ہے) "WWW.QARADA WI.NET"

ڈاکٹر محمد رأفت عثمانی عمید الکلیۃ الشرعیۃ والقانون جامعۃ الازہر

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی (فقہ الاقلیات المسلمۃ ص ۶۰۹)

اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب وغیرہ (بحوث فی قضایا فقھیۃ معاصرۃ ص ۳۲۰)

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جو حضرات عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے موقف کی درج ذیل دلیلیں ہیں۔

(۱) الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بماانزل الیک وماانزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امووا ان یکفروا بہ یرید الشیطان ان یضلھم ضلا لابعیدا (سورۂ نساء :۶۰)

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی جو دعوی رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے، اور جو آپ سے قبل نازل ہوچکی ہے، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم مل چکا ہے کہ اس کے مقابلے میں کفر اختیار کریں اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں بھٹکا کر بہت دور دراز لے جائے"۔

طاغوت سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو، غیر مسلم ملک میں شہریت حاصل کرنا گویا باختیار اسلامی نظام قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل

ہونا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف ہے، (فتاوی محمد رشید رضا مصری ج۵ ص۱۷۵۵)

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الآخرة من الخاسرین

(آل عمران :۸۵)

ترجمہ : جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں شمار ہوگا''۔

علامہ بیضاوی نے اسلام کی تفسیر توحید اور اتباع امر اللہ سے کی ہے۔

(بیضاوی مع حاشیہ الشهاب ج۳ ص۴۳)

جو حضرات اسلامی مملکت، اسلامی نظام قانون اور مسلم بالادستی سے نکل کر غیر اسلامی مملکت میں قیام پذیر ہیں یا قیام کا رادہ رکھتے ہیں، وہ اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں۔

(۳) ایک اور مقام پر قرآن نے مومن اور غیر مومن کے درمیان امتیاز کا معیار بیان کیا ہے۔

فلا وربک لایومنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مماقضیت ویسلموا تسلیما (نساء :۶۵)

ترجمه: پس آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جب تک یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہوں، آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کردیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کریں''۔

ابوبکر جصاص اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں، کہ:''اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ یا اس کے رسول ﷺ کے کسی امر کو رد کرے وہ خارج از اسلام ہے، خواہ شک کی بنیاد پر رد کرے، یا اس کو بالقصد قبول کرنے سے انکار کردے۔

(احکام القرآن للجصاص ج۳ ص۸۱۸۱)

غیر اسلامی مملکت میں قیام دوسرے لفظوں میں احکام الٰہی کو قبول کرنے سے بالارادہ گریز ہے۔

(۴)ان آیات کریمہ سے بھی استدلال کیا گیا ہے جن میں غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یاایھاالذین آمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لایھدی القوم الظالمین.

(سورۂ مائدہ:۵۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود ونصاری کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو ان سے دوستی کرے گا اس کا شمار انہی کے ساتھ ہوگا، بیشک اللہ ظالم لوگوں کوراہ یاب نہیں کرتے''۔

یاایھا الذین آمنوا لاتتخذوا آباء کم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ومن یتولھم منکم فاولئک ھم الظالمون(سورۂ توبہ:۲۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے آباء اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، جو ان سے دوستی کرے گا وہ ظالم قرار پائے گا''۔

ان دونوں آیات میں غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور ان کی اتباع وفرماں برداری کو صریح ظلم اور ارتداد قرار دیا گیا ہے، غیر مسلم ملکوں میں اقامت بالارادہ ان کی معیت ورفاقت، ان سے تعلقات، اور ان کے قوانین کی اطاعت کو مستلزم ہے، اس لیے اس کی گنجائش نہیں ہے۔

(۵)بعض احادیث سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے، جن میں صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان اقامت وسکونت سے منع کیا گیا ہے، اور حضور ﷺ نے ایسے مسلمانوں سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے، جو غیر مسلموں کے درمیان رہائش پذیر ہیں۔

[۱] غیر مسلم ملکوں کی شہریت اور وہاں قیام کی بحث کے لیے ڈاکٹر شریفہ آل سعید کی کتاب ''فقہ الجالیات الاسلامیۃ'' سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔

حدیث پاک: انابری من کل مسلم یقیم بین اظھر المشرکین

(ترمذی ، کتاب السیر، حدیث۱۶۵۴)

ترجمہ: ''میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہو''

(۶) عقلی طور پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام کا مطلب ان ملکوں کے تمام قانونی تقاضوں کی تکمیل ہے، جن میں بہت سی چیزیں خلاف شرع بھی ہیں، اور کبھی اس سے فوجی خدمات کا بھی مطالبہ ہوسکتا ہے، اور فوجی ملازمت کے درمیان اگر خدانخواستہ کسی اسلامی سلطنت سے جنگ چھڑ جائے تو اس میں غیر مسلم فوجیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لینا ہوگا، اس کے علاوہ اور بھی متعدد مراحل آسکتے ہیں جن میں خلاف شرع باتوں پر اسے عمل کرنا پڑے، ظاہر ہے کہ ایک مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ دینی طور پر اپنے کو ان شدید خطرات میں مبتلا کرے، اور اپنی ہلاکت کا سامان کرے۔

جمہور کے دلائل:

لیکن جو جواز کے قائل ہیں، ان کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے مثلاً:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھر ہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (سورۂ توبہ: ۳۳)

ترجمہ: وہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردے چاہے مشرکوں کو ناپسند لگے''۔

ومارسلنک الا رحمۃ للعالمین (سورۂ انبیاء: ۱۰۷)

اور ہم نے آپ کو سارے عالم کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا۔

ومارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا ولکن اکثر الناس لایعلمون

(سورۂ سبا: ۲۸)

ترجمہ: ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے صرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا، لیکن اکثر

لوگ جانتے نہیں ہیں،،۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن(سورۂ نحل :۱۲۵)

ترجمہ : اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور بہتر انداز سے دعوت دو اوران کے ساتھ بہتر طریق پر جدال کرو‘‘۔

قل ھذہ سبیلی ادعوالی اللہ علی بصیرۃ اناومن اتبعنی(سورہ ٔیوسف:۱۰۸)

ترجمہ : آپ کہہ دیجئے کہ میرا طریق یہی ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں دلیل پرقائم ہوں میں (بھی)اور میرے پیرو(بھی)‘‘۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دنیا کے ہر خطہ میں پہونچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے ،اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر مسلم ملکوں میں بھی جائیں ۔اور اسلام کی دعوت چاردانگ عالم میں پہونچائیں، اگر مسلمان اپنے ہی ملکوں میں سمٹ کررہ جائیں تو اسلام کی دعوت اوراس کے نمونے اسلامی دنیا تک کیسے پہونچیں گے۔

صحابہ کرامؓ نے دنیا کے سامنے جو عملی مثال پیش کی ہے،وہ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے،انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا، وہاں قیام کیا اور دین کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچائی،انہوں نے دعوت وتبلیغ کے باب میں جغرافیائی امتیاز نہیں رکھا،اور زمین کے کسی حصہ کو محض اس لیے محروم نہیں کیا کہ وہاں غیر اسلامی حکومت قائم تھی، اگر صحابہ اپنے آپ کو اسلامی ملکوں تک محدود کر لیتے تو ان کے ذریعہ وہ عالمی کام انجام نہ پاتا جو صحابہ کا امتیاز ثابت ہوا۔

قواعد فقہ سے رہنمائی:

اس سلسلے میں بعض قواعد فقیہ سے بھی رہنمائی ملتی ہے۔

(۱) مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے‘‘(الاشباہ والنظائر)

جس دور میں علماء نے غیر مسلم ملک کی شہریت کو حرام قرار دیا تھا، وہ فرانسیسی استعمار کا دور تھا، عرب ممالک، اور بالخصوص تونس اور الجزائر کا علاقہ اس استعمار کا زیادہ شکار تھا، اس استعمار کا مقصد اسلام کے خلاف منصوبے بنانا اس کی بنیادوں کو کمزور کرنا، اس کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا، سچے مسلمانوں کے ساتھ ظلم وجبر کرنا اور دینی انحراف پھیلانا تھا۔

اس دور میں ظاہر ہے کہ کون مسلمان پسند کرتا کہ اسلام دشمنوں کے ملک میں جا کر رہے، یا وہاں کا شہری بن جائے ان حالات میں علماء کو حرمت ہی کا فتوی دینا چاہئے تھا، لیکن آج حالات یکسر بدل چکے ہیں، بین الاقوامی طور پر مذہبی آزادی کا اصول تسلیم کرلیا گیا ہے، اور مسلمان کو کسی بھی ملک میں اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے آزادانہ طور پر رہنے کی آزادی اختیار حاصل ہے، اس لیے آج قدیم فتوی حرمت ہی پر اصرار کرنا مناسب نہیں، آج ضرورت ہے کہ حالات کے تغیر کے مطابق فتوی میں بھی تبدیلی لائی جائے۔

(۲) جب مصالح ومفاسد کے درمیان تعارض ہو جائے تو موازنہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اور جو پہلو غالب ہو اس کے مطابق حکم شرع عائد کیا جاتا ہے، یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے، اور اس کے متعدد نظائر قرآن وحدیث میں موجود ہیں،

آج کے دور میں کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت میں بعض نقصانات وضرر متوقع ہیں، لیکن ان کی تلافی کی صورت بھی موجود ہیں، وہاں دینی ادارے قائم کئے جائیں، مدارس و مکاتب بنائے جائیں، مساجد تعمیر کئے جائیں، علماء اور داعیوں کو وقفہ وقفہ سے دینی پروگراموں کے لیے دعوت دی جائے، مقامی سطح پر دعوت وتبلیغ کا کام کیا جائے اس طرح بڑی حد تک ان نقصانات کی تلافی ہوسکتی ہے، اور وہاں بھی خوشگوار اسلامی ماحول اور معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے، جس کی اسلام دعوت دیتا ہے، (الحمد للہ یورپ اور امریکہ میں آج اس کے بے شمار عملی نمونے موجود ہیں)

اس کے علاوہ اور بھی کئی مصلحتیں ہیں جو مسلمانوں کے وہاں قیام کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہیں مثلا

(الف) غیر مسلم ممالک اپنے شہریوں کو مکمل مذہبی آزادی ،فکر وخیال کی آزادی، اظہار کی آزادی اور جملہ سیاسی اقتصادی، اجتماعی اور فوجی حقوق دیتے ہیں، جس کے مطابق ایک شخص ایک باعزت زندگی گذار سکتا ہے، اور اپنے آئینی حقوق کے ذریعہ وہاں کی حکومت پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔

آج غیر مسلم طاقتیں بالخصوص مغربی ممالک جس طرح اسلام اور مسلم ممالک کے خلاف محاذ آراء ہیں، یا اس کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد وہاں موجود ہو تو ان کے اس قسم کے فیصلوں پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور خود حکومتوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف اس قسم کے فیصلوں میں دس بار سوچنا پڑے گا کہ اس کے نتائج خود ان ملکوں میں کیا ظاہر ہوں گے؟ اگر مسلمان وہاں نہ ہوں تو یہ بڑا قومی فائدہ اسلام اور ملت اسلامیہ کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

(ب) غیر اسلامی ملکوں میں رہ کر مسلمان اپنے وسائل سے مسلمانوں اور اسلام کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں، اور جو علماء، دعاۃ یا مسلمان وہاں پہونچیں ان کے لیے بہتر معاون ومددگار ثابت ہو سکتے ہیں، اگر ان ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں میں مسلمان نہ ہوں تو مسلم اقلیتوں کو وہاں کے وسائل سے استفادہ کی صورت کیا ہوگی؟

فقہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے:

مالایتم الواجب الابہ فھو واجب (الاشباہ والنظائر ص۹۱)

ترجمہ: جس کے بغیر واجب پورا نہ ہوتا ہو وہ بھی واجب ہے۔

دعوۃ الی اللہ اس امت کا منصبی فریضہ ہے اور اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ روئے زمین کے تمام باشندوں تک اسلام کی آواز نہ پہونچ جائے اور اس کے عملی نمونے ان کے سامنے نہ آجائیں، آج کے دور میں اسلام کی آواز ترقی یافتہ وسائل ابلاغ کے ذریعہ پہونچائی جا سکتا ہے، اور اسلامی تعلیمات سے بھی کسی حد تک روشناس کرایا جا سکتا ہے، لیکن عملی نمونہ کے لیے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کا وہاں وجود ضروری ہے، جو غیر مسلموں کے

درمیان اسلامی آئیڈیل کا کام دے، علاوہ ازیں یہ مسلمان خود بھی اپنے قول وعمل اور اخلاق و کردار سے امت غیر مسلمۃ میں دعوت کا کام کریں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کریں، اور خود ان کے ملک کا حصہ بن جائیں، کیونکہ غیر ملکیوں کا قول وعمل آج کی دنیا میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

(۴) فقہ کا ایک اور مشہور قاعدہ ہے:

الضروریات تبیح المحظورات......ضرورت کی بنیاد پر بعض ممنوع چیزوں کے ارتکاب کی اجازت دی جاتی ہے۔

کبھی مسلمانوں کو اپنے ملک کے بعض وسائل کی بناء پر ہجرت کی ضرورت پیش آتی ہے اور موجودہ حالات میں کوئی مسلم ملک کسی دوسرے ملک کے شہری کو (اگر چہ وہ مسلمان ہو) بحثیت ایک شہری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، اور نہ وہ حقوق اس کو دینے کے لیے تیار ہے، جس کے ذریعہ کوئی شخص باوقار زندگی گذار سکے، جب کہ بہت سے غیر مسلم ملک موجود ہیں جو کسی بھی ملک کے شہری کو ان کے اپنے ضوابط کے مطابق شہریت اور جملہ حقوق شہریت دینے کے لیے تیار ہیں، اور وہاں آزاد، اور گھٹن وتعفن سے پاک فضا میں انسان کوئی بھی بڑا سے بڑا تعمیری کام کرسکتا ہے، ان حالات میں ضرورت کا تقاضا ہے کہ اگر چہ کہ فی نفسہ مسلم ملک چھوڑ کر غیر مسلم ملک جانا پسندیدہ نہیں ہے، لیکن حالات کی مجبوری کے تحت ایسے مسلمانوں کو وہاں جانے اور وہاں کی شہریت حاصل کرنے کی اجازت دی جانی چاہئے۔

مسلک راجح:

مذکورہ مباحث پر تحقیقی نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جواز کی رائے جس کو جمہور علماء نے اختیار کیا ہے، زیادہ لائق ترجیح ہے، اور اس کے کئی اسباب ہیں۔

(۱)........اس حد تک تمام علماء کا اتفاق ہے (خواہ وہ جواز کی رائے رکھتے ہوں یا عدم جواز کی) کہ غیر مسلموں سے تعلق خاطر، اور اسلامی ملکوں کے مقابلے میں ان کے ملکوں کی عظمت واحترام کی بناء پر غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا ناجائز ہے، عدم جواز کے تمام وہ

دلائل جو مانعین پیش کرتے ہیں، ان میں بآسانی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ ان کا مصداق یہی قدر مشترک ہے۔

(۲) اور اگر عدم جواز کی رائے علی الاطلاق مان بھی لی جائے تو بھی اس کو اس استعماری دور پر محمول کیا جائے گا جب کہ غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحب ایمان کا داخلہ مشکل تھا، اور اس کو ارتداد یا تعاون علی الکفر کے مترادف مانا جاتا تھا، آج وہ صورت حال باقی نہیں رہی، اب مسلمانوں کی بڑی تعداد وہاں مقیم ہے اور بڑے سکون اور آزادی کے ساتھ دینی زندگی گذار رہی ہے، بڑے بڑے دینی مراکز وہاں قائم ہیں، اسلام کی اشاعت کا کام بھی وہاں ہو رہا ہے، اور مسلمان اپنے نومسلم بھائیوں کی مدد کرتے ہیں، اور ان کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کرتے ہیں ان مسلمانوں نے اپنی تمام تر توقعات اور صلاحیتیں اسی سرزمین کے لیے مرکوز کر دی ہیں، اور دوبارہ وطن واپسی کا کوئی خیال نہیں رکھتے ان حالات میں عدم جواز کی رائے یقیناً بعد از وقت اور دشوار کن ہے۔

(۳) عدم جواز کے قائلین نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اپنے مفہوم و مصداق کے اعتبار سے قطعی نہیں ہیں، بلکہ ان میں تاویل کا احتمال موجود ہے مثلاً

(الف) جن آیات کریمہ کو اس استدلال میں پیش کیا گیا ہے کہ غیر مسلم ملک کی شہریت احکام اسلامی کا بالارادہ ترک اور کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا اظہار ہے، اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے۔

کہ غیر مسلم ملکوں کے جو قوانین اسلامی احکام سے متصادم ہیں، ضروری نہیں کہ مسلمان ان کو من وعن قبول کر لیں، بلکہ ان کو حق ہے (اور ان کو یہ کرنا چاہیئے) کہ وہ ان قوانین کے بارے میں اپنے مشترکہ احساسات ایوان حکومت کے سامنے رکھیں، ان کو تبدیل یا ان میں مناسب ترمیم کرانے کی متحدہ جدوجہد کریں اور جب یہ ترامیم منظور ہو جائیں تو قانون کی اس لچک سے استفادہ کریں جس سے خلاف شریعت عمل کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، مثلاً مرنے کے بعد مورث کے ترکہ کا قانون یورپی ملکوں میں غیر اسلامی ہے، لیکن اس میں یہ گنجائش رکھی گئی

ہے، کہ اگر کوئی فرد مرنے سے پہلے اپنے ورثہ کی تقسیم کے لیے کوئی لائحہ عمل تجویز کر دے تو اس کی موت کے بعد ورثہ پر لازم ہوگا کہ وہ اس کے تجویز کردہ طریقۂ کار کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں، قانون کی اس شق سے استفادہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو چاہئے کہ مرنے سے قبل یہ وصیت تحریر کر جائیں کہ اس کی موت کے بعد اس کے ترکہ کی تقسیم اسلامی شریعت کے مطابق ہوگی، مورث کے اس عمل کے بعد ورثہ پر قانونی طور پر لازم ہو جائے گا کہ وہ شریعت کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں۔

اسی طرح ان ملکوں میں یہ قانون ہے کہ نکاح کا رجسٹریشن کرانا لازمی ہے اس کے بغیر نکاح غیر قانونی غیر لازم اور غیر نافذ قرار پاتا ہے، اور اس نکاح کی بنیاد پر کسی قسم کے مطالبات ثابت نہیں ہوتے، لیکن اگر کوئی مسلمان اسلامی طور پر نکاح کرے اور اس کا رجسٹریشن بھی کرائے تو قانونی طور پر ممنوع نہیں ہے۔

اس طرح ان غیر مسلم ملکوں میں قانونی مشکلات کا حل دریافت کیا جا سکتا ہے، اور وہاں کی شہریت سے ہرگز لازم نہیں آتا کہ ایک شخص نے اپنے دین وایمان کا سودا بھی کر لیا ہو۔

(ب) بہت سے غیر مسلم ملکوں میں مسلم ممالک کے لیے یہ قانونی اختیار دیا گیا ہے کہ وہاں کا کوئی شخص اگر غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کر لے تو یہاں کی شہریت کے ساتھ اپنے ملک کی شہریت بھی باقی رکھ سکتا ہے، یعنی وہ بیک وقت دو ملکوں کی شہریت کا حامل ہو سکتا ہے، دو پاسپورٹ رکھ سکتا ہے، اس لیے غیر مسلم ملک کی شہریت سے ہرگز لازم نہیں آتا کہ اسلامی ریاست اور اس کے نظام قانون سے بھی انسان دستبردار ہو گیا ہو۔

(ج) پھر غیر مسلموں کے ساتھ معاملات اور سماجی تعلقات اسلام میں ممنوع نہیں ہیں، صرف ان سے وہ قلبی ارتباط ممنوع ہے جس سے انسان کی دینی زندگی متأثر ہو اور اس کا ایمانی رسوخ کمزور ہو، اسلام نے صرف ان غیر مسلموں کے ساتھ قطع تعلق کا حکم دیا ہے، جو ان کے دشمن ہوں یا ان کے اور ملت اسلامیہ کے لیے نقصان دہ ہوں، لیکن عام امن پسند غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات ومعاملات سے وہ ہرگز نہیں روکتا، قرآن نے یہ مضمون پوری

صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

لاینھاکم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم (سورۂ ممتحنہ:۸)

ترجمہ : اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جن سے تمہاری دینی جنگ نہیں ہے، اور جو تم کو تمہارے ملکوں سے نکالنا نہیں چاہتے''۔

(د) دراصل اس موقع پر یہ فرق ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کا ممنوعہ موالات اور جس ملک میں انسان آباد ہو وہاں کے انتظامی قوانین (جن کا اسلامی احکام سے کوئی تعلق نہ ہو) کا احترام یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

(ہ) جہاں تک غیر مسلم ملکوں میں عسکری ملازمت کا مسئلہ ہے تو اولا جو ملک ہر قسم کے مطالبات اور جملہ حقوق فراہم کرتا ہے، الخرم بالغنم کے اصول پر اس ملازمت کا مطالبہ بیجا نہیں ہے۔

ثانیا : ہر ملک میں فوجی ملازمت کا جبری اصول نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر ملکوں میں انسان کے اپنے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے قیام کے لیے ایسے ملک کا انتخاب کریں جہاں فوج کی جبری ملازمت کا قانون نہ ہو۔

اور فوجی ملازمت کی صورت میں بھی مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالات میں فوجی مہم میں شرکت سے معذرت کردیں، اس لیے کہ تمام ملکوں نے حریت ادیان کا اصول تسلیم کرلیا ہے، اور فوج میں باقاعدہ مذہبی رہنما رکھے جاتے ہیں، ان کے لیے مساجد اور بنیادی، دینی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے، غرض اس طرح کے جتنے شبہات وخطرات پیش کئے جاتے ہیں ان تمام کا مناسب حل موجود ہے۔

ان تفصیلات سے میری غرض صرف اتنی ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام یا وہاں کی شہریت شجر ممنوعہ ہرگز نہیں ہے، البتہ مسلمانوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے ملکوں میں قیام کریں اور اسلامی نظام قانون کے تحت زندگی گذارے اور دوسرے ملکوں کا سفر یا قیام عارضی

طور پر محض ضرورت کے بقدر کرے، لیکن اگر کسی کے لیے ایسے حالات وظروف پیدا ہو جائیں کہ ان میں نسبتاً وہ زیادہ پرسکون، پرامن اور خوشگوار زندگی گذار سکتا ہو، تو اس کو یہ گنجائش ہوگی کہ وہاں رہے بشرطیکہ درج ذیل امور کی رعایت رکھے۔

(۱) وہاں رہ کر دینی تشخص اور اسلامی وجود گم نہ ہو، مستقبل قریب میں اس کے یا اس کی اولاد کے لیے دینی اعتبار سے کوئی خطرہ نہ ہو اور باعزت زندگی گذارے، ذلت آمیز زندگی نہ گذارے، اگر اس قسم کی کسی بھی صورت حال کا سامنا ہو تو اس ملک میں جانا یا رہنا جائز نہیں، اور اگر جاچکا ہو تو وہاں سے اپنے ملک لوٹ جانا واجب ہے۔

(۲) مسلمان وہاں دین وملت کا صحیح نمائندہ ہو، اپنے اخلاق، عمل، اور خلوص و صداقت سے اسلام کی صحیح نمائندگی کرے جس کا اثر اس کے غیر مسلم پڑوسیوں پر پڑے۔

(۳) اس ترک وطن کو وہ ہجرت کی طرح پاک مقاصد کے لیے اختیار کرے، اور اپنے احساسات وعمل کے ذریعہ اس انتقال مکانی کو اپنے اور ملت اسلامیہ کے لیے ہر طرح مفید اور بامقصد ثابت کرے۔

(۴) مسلمان تارک وطن اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو ہر قسم کے فکری اور اخلاقی امراض اور انحرافات سے ہر ممکن محفوظ رکھے اور ان سے حفاظت کی تدابیر کرے۔ [۱]

جمہوری انتخابات - احکام اور مسائل

موجودہ دَور جس میں مسلمان متعدّد ممالک میں اقتدار سے محروم اور اقلیتی زندگی گذار رہے ہیں، مسلمانوں کے لئے ان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں متعدّد مسائل پیدا ہوگئے ہیں، ان مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ جمہوری ممالک میں انتخابات کا ہے، جہاں کسی ایک قوم، خاندان، یا مذہب کی نہیں بلکہ اکثریت کے ووٹ سے کامیاب ہونے والی سیاسی جماعت کی حکومت ہوتی ہے، اور ان انتخابات میں بحیثیت اُمیدوار اور بحیثیت رائے دہندہ ہر قوم و مذہب کے افراد کو حصّہ لینے کی اجازت ہوتی ہے گویا یہ پُر امن سیاسی مسابقت کا دور ہے اور اس میں جو پیچھے رہ جائے گا وہ بہت سے حقوق وترقیات سے محروم رہ جائے گا۔

عہدہ کی طلب:

اگر چہ کہ عام حالات میں اسلامی مزاج کے مطابق عہدہ واقتدار کی طلب پسندیدہ چیز نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

یاعبد الرحمٰن بن سمرة ! لتسال الامارة فانک اعطیتها من غیرمسئلةٍ اعنت علیها و ان اعطیتها عن مسئلةٍ وکلت الیها

(متفق علیه، مشکوٰة کتاب الامارة، صفحہ ۳۲۰)

ترجمہ : ”اے عبدالرحمٰن بن سمرۃ! عہدہ کی طلب مت کرو، اگر تم کو بلا طلب عہدہ مل جائے تو اللہ کی نُصرت تم پر نازل ہوگی، اور طلب کے بعد کوئی عہدہ حاصل کرو تو اس کے ذمّہ دار تم خود قرار پاؤ گے“۔

حضرت ابو ہریرۃؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انکم ستحرصُون علی الامارة وستکون ندامة یوم القیٰمة فنعم

المرضعة وبئست الفاطمة۔ (رواہ البخاری ، مشکوۃ : ص۳۲۰)

ترجمہ : ''عنقریب تم عہدوں کی مسابقت میں کود پڑو گے۔ حالاں کہ یہ قیامت کے دن ندامت کا باعث ہوگا۔ دودھ دینے والا اور لذت بخش عہدہ بہت اچھا لگتا ہے، لیکن جب عہدہ چھن جاتا ہے اور دودھ کا تھن مُنہ سے نکل جاتا ہے، تو اتنا ہی بُرا لگتا ہے، پھر کیا حاصل ایسی لذّتوں کا جن کے بعد حسرتوں کا سامنا کرنا پڑے''۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں اور میرے دو چچا زاد بھائی خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے، اور دونوں نے یکے بعد دیگرے حضورﷺ سے کسی عہدہ کی درخواست کی اس پر حضورﷺ نے ارشاد فرمایا :

انا واللّٰہ لا نولّی علیٰ ھذ العمل احدًا مسألة ولااحدا حرص علیه

(متفق علیه ، مشکوٰۃ :۳۲۰)

ترجمہ : ''ہم اللہ کی قسم یہ ذمّہ داری ہرگز کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کرتے جو اس کا طلب گار یا اُمیدوار ہو''۔

اسلامی معاشرہ میں ہمیشہ وہ لوگ اچھے مانے جاتے رہے ہیں جو اپنے کو عہدوں کی دوڑ اور سیاسی مسابقت سے دُور رکھتے ہیں، ایک موقعہ پر رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

تجدون من خیر الناس اشدھم کراھیة لھذا لامر حتی یقع فیه

(متفق علیه ، مشکوٰۃ :۳۲۰)

ترجمہ : تم ہمیشہ دیکھو گے کہ اچھے لوگ اس دوڑ سے دور بھاگتے ہیں جب تک کہ اس میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

اجتماعی مفادات کے تحفّظ کے لئے آگے بڑھنا:

لیکن وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ بسا اوقات قومی اور اجتماعی مفادات کے تحفظ کے لئے اچھے لوگوں کو بھی اس کام کے لئے آگے بڑھنا پڑتا ہے، اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو خراب لوگ ان عہدوں پر فائز ہوجائیں گے اور اس سے پوری قوم بحیثیت اجتماع متأثر ہوگی، جس کی ذمّہ داری

کسی نہ کسی درجے میں ان لوگوں پر بھی عائد ہوگی جو اس سیاسی مسابقت سے اہلیت کے باوجود کنارہ کش رہے، حضرت عائشہؓ کا ایک ارشاد اس سلسلے میں ہماری بڑی حد تک رہنمائی کرتا ہے۔

''ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ میں اور چند مہاجرین کے صاحب زادے ایک جگہ جمع ہوئے، اور ہم لوگوں نے ارادہ کیا کہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ سے ملاقات کریں، پیشِ نظر اپنی معاشی مشکلات تھیں، مگر اس سے قبل ہم لوگوں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا، ہم لوگ اُمّ المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنی معاشی مُشکلات اور قرض وغیرہ کا ذِکر کیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ وہ اپنے سلطان سے دُور دُور رہتے ہیں، ہم نے عرض کیا ہمیں ڈر ہے کہ کہیں وہ کوئی عہدہ ہمیں نہ دے دیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

سبحان اللّٰہ فاذا لم یستعمل خیارکم یستعمل شرارکم

(التلخیص الحبیر : لابن حجر، جلد۲، ص۴۰۲)

''سبحان اللہ! اگر تم میں اچھے لوگ کام میں نہ لگیں گے تو بُرے لوگوں کو یہ کام دے دیا جائے گا''۔

اُسوۂ یُوسفیؑ:

اس سلسلے میں اصل بنیاد حضرت یوسف علیہ السلام کا طرزِ عمل ہے، جس کو قرآن نے نقل کیا ہے، حضرت یوسفؑ نے سلطانِ مصر سے مطالبہ کیا تھا کہ

اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم (یوسف:۵۵)

ترجمہ : مجھے زمینی خزانوں کا ذمّہ دار بنادیجئے، میرے پاس عِلم وعقل بھی ہے، اور نگرانی کا سلیقہ بھی رکھتا ہوں۔

حضرت یوسفؑ کی اس طلب کے پیچھے بالیقین کسی حظِ نفس کا دَخل نہیں تھا، وہ معصوم پیغمبر تھے، ان کے بارے میں اس طرح کا تصوّر بھی گناہ ہے، بلکہ ان کی اس طلب کے پیچھے محض انسانیت کا دَرد، اور مفاداتِ عامہ کے تحفّظ کا جذبہ کارفرما تھا، اور حضرت یوسفؑ جانتے تھے کہ اگر میں یہ

اَہم ترین ذمّہ دارانہ مَنصب حاصل نہ کروں تو مصر کو قحط کے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

حضرت یوسف کے اس عملی نمونے سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ انسان اپنے آپ کو کسی ایسے عمل کے لئے پیش کرسکتا ہے، جس کی اَہلیت اس کے اندر موجود ہو، اور اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کام کے لائق نہ ہو۔ تو اس پر لازم ہے کہ اس کام کے لئے اپنی خدمات پیش کرے۔ اسی طرح اس سے یہ نتیجہ بھی اَخذ کیا گیا ہے کہ بوقتِ ضرورت انسان اپنی بعض ان صفات کی طرف بھی اشارہ کرسکتا ہے جو مطلوبہ کام کے لئے ضروری ہوں، اگرچہ کہ بظاہر اس میں خودستائی محسوس ہوتی ہو، (احکام القرآن للقرطبی:۱۴۲/۹، روح المعانی ۵/۱۳، احکام القرآن للجصاص:۱۷۴/۳)

اسوۂ سلیمانیؑ:

اس باب میں ایک اور اہم ترین نمونہ حضرت سلیمان کی دعا بھی ہے، حضرت سلیمانؑ نے رب العالمین سے مانگا تھا کہ

"رب ھب لی ملکا لاینبغی لاحدٍ من بعدی انک انت الوھاب (ص:۳۴)

ترجمہ: ''پروردگار! مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو میسر نہ ہوسکے یقیناً آپ بخشنے والے ہیں''۔

یہ روئے زمین پر سب سے بڑے منصب کی طلب تھی لیکن اس کا مقصد بھی بس انسانوں کو صحیح فائدہ پہونچانا، خلقِ خدا کو جبر وظلم سے نجات دِلانا اور روئے زمین پر خدائی حکومت قائم کرنا تھا، اور ظاہر ہے کہ ان عظیم مقاصد کی تکمیل کے لئے اس دور میں حضرت سلیمانؑ سے بہتر شخصیت کون ہوسکتی تھی۔

علماء نے اس واقعہ سے بھی وہی نتائج اخذ کئے ہیں جو حضرت یوسفؑ کے ذیل میں مذکور ہوئے۔ (احکام القرآن لابن العربی: ج۲/ص۱۹۹)

علامہ ابن قدامہ نے اس سلسلے میں بہت اچھا تجزیہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

''لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں، اور تینوں کے احکام مختلف ہیں۔''

(۱) ایسا شخص جن میں مطلوبہ عہدہ کی اَہلیت موجود نہ ہو، ایسے شخص کے لئے وہ عہدہ قبول کرنا جائز نہیں۔

(۲) ایسا شخص جس میں اہلیت موجود ہو اور قابلِ اعتماد اور لائق شخص ہو، مگر وہ اپنے میدان میں تنہا شخص نہ ہو، بلکہ مطلوبہ معیار کے متعدد لوگ معاشرہ میں موجود ہوں، ایسے شخص کے لئے عہدہ قبول کرنا جائز ہے، واجب نہیں، اس لئے کہ اہلیت کے لحاظ سے وہی شخص متعین نہیں ہے، البتہ امام احمدؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں عہدہ قبول کرنا اگرچہ کہ جائز ہے، مگر اس جنجال میں نہ پڑنا بہتر ہے، اس لئے کہ یہ پرخطر وادی ہے، اپنے آپ کو بچاتے ہوئے تمام متعلقہ لوگوں کے حقوق ادا کرنا آسان کام نہیں ہے، البتہ بعض لوگوں نے ضرورت منداور غیر ضرورت مند کا فرق کیا ہے، کہ اگر اہل شخص ضرورت مند ہو تو اس کے لئے عہدہ قبول کرلینا مستحب ہے، (۳) ایسا شخص جس میں عہدہ کی اہلیت موجود ہو، اور اس کے سواء کوئی دوسرا شخص اس معیار کا موجود نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص پر عہدہ قبول کرنا واجب ہے، امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ اس صورت میں بھی عہدہ قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

(المغنی: ج۱۱،ص ۳۷۶)

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں عہدۂ قضاء قبول کرنے کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ اگر تمام لوگ اس سے بھاگنے لگیں تو اس اَہم ترین ذمّہ داری کو کون ادا کرے گا، جبکہ بڑے بڑے صحابہ نے یہ ذمّہ داری قبول کی ہے، عہدِ صدیقی میں حضرت فاروقِ اعظمؓ قاضی تھے، عہدِ فاروقی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو منصبِ قضا دیا گیا، حضرت عمرؓ نے اپنے گورنروں کو فرمان جاری کیا کہ عہدۂ قضا ڈھونڈ ڈھونڈ کر صرف صالحین کو دیا جائے، وغیرہ، اس طرح کی بہت سی مثالیں عہدِ صحابہ میں موجود ہیں، البتّہ اگر اہل شخصیتیں کئی موجود ہوں تو کسی ایک متعین شخص پر وجوب عائد نہیں ہوگا، اسی طرح اگر کوئی صاحبِ علم وتحقیق شخص محسوس کرتا ہو کہ عہدۂ قضا یا اور کوئی ذمّہ دارانہ منصب قبول کرنے کے بعد اس کا علمی اور تحقیقی سفر سست ہو جائے گا، تو ایسے شخص کے لئے بہتر ہے کہ وہ عہدہ سے دُور رہ کر علم وتحقیق کے کاموں میں مصروف رہے۔

(فتح الباری: ج ۱۳/ص ۱۰۸)

فقہاءِ حنفیہؒ میں علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

عہدہ کی طلب ہر صورت میں ممنوع نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں ممنوع ہے جبکہ اس عہدہ کے لائق دوسرے افراد موجود ہوں، اگر اس عہدہ کے لائق دوسرے افراد موجود نہ ہوں اور تنہا وہی شخص اس عہدہ کے لئے موزوں ہو تو اس پر واجب ہے کہ مفاداتِ عامہ کے تحفظ کے لئے عہدہ حاصل کرے، اور لوگوں کو شر و رو فِتن میں پڑنے سے بچائے۔ (بحر الرائق کتاب القضاء: ج ٦ ص ٤٥٩، کذا فی فتح القدیر: ج ٧، ص ٢٤٤، فتاویٰ ھندیه: ج ٥، ص ١٣١، الاحکام السلطانیه للماوردی: ص ٧٥)

سلفِ صالحین کی ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ حقوقِ عامّہ کے تحفظ کے لئے عہدہ کی طلب اور اس کے لئے تگ و دو ممنوع نہیں ہے، بشرطیکہ اس میں اَہلیت موجود ہو اور اس کے آگے نہ بڑھنے کی صورت میں وہ چیز کسی غلط ہاتھ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

البتّہ بہتر یہ ہے کہ خود پرچۂ اُمیدواری داخل نہ کرے بلکہ اس کی طرف سے دوسرے لوگ پرچۂ نامزدگی داخل کریں، تا کہ طلب عہدہ کی بنا پر لوگوں کی نگاہ میں متہم نہ ہو، بعض فقہاء نے اس کا لحاظ کیا ہے۔

علامہ کاسانی کتاب ادب القاضی میں لکھتے ہیں: ''عہدۂ قضا کے طالب کو منصبِ قضا دینا ناجائز نہیں ہے، اگر اس میں اس عہدہ کی واقعی اہلیت موجود ہو تو باتفاق فقہاء ایسے شخص کو عہدہ قضا دینا دُرست ہے، البتّہ بہتر ہے کہ ایسے شخص کے بجائے کسی ایسے شخص کو تلاش کیا جائے جس میں عہدہ کی طلب نہ ہو اس لئے کہ طلب کی بنا پر انسان اپنے حق میں متہم ہو جاتا ہے۔

(بدائع الصنائع کتاب ادب القاضی: ج ٥، ص ٤٣٩)

ہمارے بزرگوں میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی بھی یہی رائے ہے، تحریر فرماتے ہیں: ''اگر واقع میں وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبہ سے اس میدان میں آیا ہے تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے،

اور بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر دے۔

(جو اھر الفقه: ج۲،ص۲۹۱۔مطبوعہ دیوبند ۱۹۹۷ء)

جمہوری پارلیامنٹ جب کوئی قانون خلافِ شرع پاس کرے

رہی یہ بات کہ جمہوری ممالک میں جو پارلیامنٹ وجود میں آتی ہے اس کو اسلامی قانون سے کوئی غرض نہیں ہوتی اور کبھی وہ ایسا قانون بھی بنا سکتی ہے جو شریعت کے خلاف ہو جبکہ پارلیمنٹ کے تمام اراکین کو ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے۔

یہ صورتِ حال بظاہر دُشوار نظر آتی ہے لیکن غور کیا جائے تو اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اس لئے کہ جمہوری ممالک میں پارلیامنٹ کے اَراکین کو ملک کے جس دستور سے وَفاداری کا حَلف اٹھانا پڑتا ہے، وہ مُلک کا وہ دستور ہے جس پر پورے قانون کی اساس ہے، اور جو اُصولی طور پر نا قابلِ ترمیم مانا جاتا ہے اور تہائی اکثریت سے جن قوانین میں تبدیلی ہوتی ہے ان سے حزب اختلاف کو اختلاف کرنے کا حق ہوتا ہے، اور اگر مان لیا جائے کہ زبردست اکثریت سے دستور میں بھی تبدیلی ممکن ہو، تو مخالف اقلیت اظہار اختلاف کا حق رکھتی ہے، اور کم از کم پارلیامنٹ کی سطح تک اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہے۔ اور اس حد تک اختلافِ رائے کے بعد میرے خیال میں متعلقہ ممبران پر حکومت کے اعمال کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

کافرانہ قیادت کے تحت عہدہ قبول کرنا:

اور میرے اس خیال کی بنیاد علماء وفقہاء کی وہ گفتگو ہے جو انہوں نے کافرانہ یا فاسقانہ قیادت کے تحت کوئی ذمّہ دارانہ مَنصب قبول کرنے کے تعلق سے کی، علاوہ ازیں بعض آیات و اَحادیث سے بھی رہنمائی ملتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعونِ مصر سے ایک ذمّہ دارانہ عہدہ طلب فرمایا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کافرانہ قیادت کے تحت ذمّہ داری قبول کی جاسکتی ہے، علامہ ابن العربی نے ایک پیغمبر کے لیے کافرانہ قیادت کے تحت مَنصب کے سوال کو بڑی اَہمیت سے اٹھایا ہے اور پھر اس کا پُر تکلف جواب بھی دیا ہے۔ (احکام القرآن لابن العربی: ج ا، ص ۴۴۳)

لیکن اصحابِ تحقیق علماء نے اس سوال وجواب سے قطعِ نظر اسوۂ یوسفیؑ سے یہ حکم مُستنبط

کیا ہے کہ کافرانہ قیادت کے تحت منصب قبول کرنا جائز ہے۔

(اعلاء السنن علامہ ظفر احمد تھانوی: ج ۱۵،ص ۵۴)

اسی طرح متعدد صحابہ اور تابعین کے طرزِ عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ ظالمانہ یا فاسقانہ قیادت کے تحت کام کرنا یا کوئی عہدہ قبول کرنا جائز ہے۔

صاحبِ ہدایہ نے اس ذیل میں حضرت امیر معاویہؓ کے قاضیوں کی مثال دی ہے جبکہ وہ حضرت علیؓ سے برسرِ پیکار تھے اور یقیناً حق پر نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی خواہش پر متعدد صحابہؓ نے منصبِ قضا قبول کیا، مثلاً حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت فضالہ بن عبیدہؓ وغیرہ۔

(ھدایہ کتاب القضاء: ج ۳،ص ۱۱۷)

لیکن اس کی اچھی مثال حجاج کے دَور کے عہدیداران ہیں، امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ الوسط میں نقل کیا ہے کہ حجاج نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے صاجزادے حضرت ابوبردہؓ کو قاضی بنایا تھا اور حضرت سعید بن جبیرؒ کو ان کا معاون قرار دیا تھا، بعد میں اس ظالم نے حضرت سعید بن جبیرؒ کو قتل کر دیا، اور اس کے چھ ماہ بعد خود بھی موت سے ہمکنار ہوا۔ حضرت سعید بن جبیرؒ کے بعد حجاج کو کسی اور کو قتل کرنے کا موقع نہیں ملا، گویا حضرت سعید حجاج کے آخری مقتول تھے۔

(زیلعی: ج ۲،ص ۲۰۳)

حافظ ابونعیم تاریخ اصبہان میں لکھتے ہیں، کہ حجاج کے دَور میں وہ اصبہان کے قاضی تھے بعد میں حجاج نے ان کو معزول کر دیا۔ (زیلعی : ج ۲،ص ۲۰۳)

ابن القطانؒ کا بیان ہے کہ ابومحمد طلحہ بن عبد اللہ بن عوفؓ، یزید بن معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں مدینہ کے قاضی تھے، جبکہ طلحہؒ مشہور تابعی ہیں اور حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوبکرؓ، وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ (زیلعی : ج ۲،ص ۲۰۳)

جب قضا جیسا نازک منصب قبول کرنا جائز ہے تو دوسرے نسبتہً کمتر درجہ کے مناصب قبول کرنے کی بدرجہ اولیٰ اجازت ہونی چاہئے، احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض کام ایسے ہیں جن کو ہر حال میں انجام دینا ضروری ہے خواہ اس کو انجام دینے والی قیادت صالح ہو یا

غیر صالح، اور امت پر ضروری ہے کہ اس حد تک وہ اپنی قیادت کی اطاعت کرے، مثلاً حضور ﷺ نے جہاد کے تعلق سے فرمایا:

الجهاد واجب عليكم مع كل امير برا كان او فاجرا

(رواه ابو دؤد و سكت منه ،ا علاء السنن :ج١٥/٥٥)

ترجمہ: جہاد ہر حال میں واجب ہے خواہ امیر الجہاد نیک ہو یا بد۔

بخاری و مسلم میں حضرت عمرو بن النعمان کی روایت ہے۔

ان اللّٰه ليويد هذا الدين بالرجل الفاجر (اعلاء السنن :ج١٥/٥٥)

ترجمہ: بیشک اللہ اس دین کو فاسق شخص کے ذریعہ قوت پہونچائے گا۔

جہاں تک خلافِ شرع امور میں اطاعت کا معاملہ ہے تو ان امور میں اطاعت نہ کرے اور اظہارِ رائے کے بعد ان امور سے اپنے آپ کو غیر متعلق کرلے اور میرے خیال میں ردعمل کے اظہار، اور قلبی ناپسندیدگی کی صورت میں اس شخص پر شرعاً کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی، اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ وہ اس کو معاف فرمادے گا۔

اس مسئلہ پر مسلم شریف کی ایک روایت سے کافی روشنی ملتی ہے۔

حضرت عوف بن مالک الاشجعیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الا من ولى عليه و الٍ فراٰه ياتى شيئا من معصية اللّٰه فليكره ماياتى من معصية اللّٰه ولا ينزعن يداً من طاعته (رواه مسلم ، مشكوٰة : ٣١٩، كتاب الامارة)

ترجمہ: ''سنو! جس پر کوئی والی مقرر کیا جائے پھر اس کو کسی معصیت میں مرتکب پائے، تو اس کی اس حرکت کو دل سے ناپسند کرے لیکن اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے''۔

اسی طرح حضرت امِ سلمہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يكون عليكم امراء تعرفون وتنكرون فمن انكر فقد برى ومن كره فقد سلم ولكن من رضى وتابع قالوا افلا نقاتلهم قال لا ماصلوا الا ماصلوا اى من كره بقلبه وانكر بقلبه .(رواه مسلم ، مشكوٰة : ٣١٩)

ترجمہ : تم پر ایسے امراء مسلط ہوں گے جو معروف و منکر ہر طرح کا کام کریں گے جو ان کے منکرات پر نکیر کرے گا وہ بَری ہوگا، اسی طرح جو کم از کم دل سے ان کے خلاف شرع حرکتوں کو ناپسند کرے وہ بھی نجات پائے گا۔ البتہ جو ان سے راضی ہو اور ان کی اتباع کرے (اس پر اس کا وبال آئے گا) صحابہ نے عرض کیا، کیا ہم ان سے جنگ کر سکتے ہیں حضور نے فرمایا نہیں جب تک وہ نماز پر قائم ہیں۔

یہاں کرہ وانکر، سے مراد یہ ہے کہ زبان سے ردِ عمل کا اظہار ضروری نہیں ہے بلکہ دلی نفرت نجات کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح فتنہ کے ایام میں جب حضرت عثمان اپنے مکان میں محصور تھے، اور مسجد نبوی پر باغیوں کا قبضہ تھا، کسی نے حضرت عثمان سے دریافت کیا کہ کیا ہم ان کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں، حضرت عثمان نے فرمایا:

اذا احسن الناس فاحسن معهم و اذا اساء و افاجتنب اساء تهم

(اعلاء السنن :ج ۱۵،ص ۵۱)

ترجمہ : اگر ان لوگوں کا سلوک بہتر ہو تو ان کے ساتھ تم بھی حسن سلوک کرو، اور اگر سلوک خراب ہو یعنی خلافِ شرع کام کریں تو ان کے اس عمل سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھو"

قواعد فقہیہ سے رہنمائی:

اس سلسلے میں بعض قواعد فقہیہ سے بھی روشنی ملتی ہے۔

(۱) ایک فقہی ضابطہ ہے جس کو متعدد فقہاء اور اصولیین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

مالایتم الجواب الابه فهو واجب (الاشباه والنظائر لابن نجیم الحنفی ص ۹۱، القواعد والفوائد لابن مکی العاملی ج ۱ص ۱۹۲، الاشباه والنظائر للسیوطی الشافعی ۹۷)

ترجمہ : جس چیز پر واجب کی تکمیل موقوف ہو وہ بھی واجب ہوتی ہے"۔

جمہوری ممالک میں اگر مسلمان انتخابی عمل میں حصہ نہ لیں، اور بعض خلاف شرع امور کے ارتکاب یا اور شرعی طور پر ناپسندیدہ صورت حال سے دوچار ہونے کے خوف سے اپنے آپ

کو بالکلیہ الگ تھلگ کرلیں، تو بہت سے قومی واجبات کی تکمیل ممکن نہ ہوگی، اور بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا بہت بڑا نقصان ہوگا، مثلاً

پارلیامنٹ اور اسمبلیاں جو ملکی یا بین الاقوامی تجاویز منظور کرتی ہیں، کوئی مسلم نمائندہ نہ ہونے کی صورت میں وہ ان کو منظور کرنے میں آزاد ہوں گی، خواہ وہ مسلم مفادات کے موافق ہوں یا مخالف، لیکن اگر پارلیامنٹ میں مسلم نمائندگی موجود ہو تو اس قسم کے خطرات بڑی حد تک کم ہوسکتے ہیں۔

پارلیامنٹ میں مسلم نمائندگی نہ ہو تو اسلام اور ملت اسلامیہ کی صحیح صورت حال کا علم ملک کی پارلیامنٹ اور غیر مسلم ارکان کو کس طرح ہوگا، اسی طرح مسلمانوں کے خلاف پھیلائے جانے والے پروپیگنڈوں کا دفاع کون کرے گا؟ مسلمانوں کی ضروریات اور قومی مسائل پارلیامنٹ میں کون رکھے گا، اور حکومت کے رفاہی منصوبوں سے مسلمان کس طرح استفادہ کریں گے؟ ان تمام سوالات کا جواب صرف ایک ہے، کہ پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی ضروری ہے اس کے بغیر مسلمانوں کے قومی مسائل حل نہیں ہوسکتے اور ان کے اجتماعی مفادات کی تکمیل ممکن نہیں، اس طرح مذکورہ قاعدہ فقہیہ کی رو سے مسلمانوں کا انتخابات میں حصہ لینا اور پارلیامنٹ تک پہونچنے کی کوشش کرنا واجب ہے۔

دوسرا قاعدہ ہے: الضرر الاشد یزال بالاخف.

(الاشباہ والنظائر لابن نجیم الحنفی ص۸۸-۸۹/، الاشباہ للسیوطی ص۹۶/، الموافقات للشاطبی ج۲ ص۱۴۱/، شرح القواعد الفقھیہ للزرقاء۱۴۵)

ترجمہ: بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان گوارا کیا جائے گا۔

انتخاب میں حصہ لینے میں یہ اندیشہ ضرور ہے کہ قومی اسمبلیاں عددی اکثریت کے بل پر بعض ایسے قوانین بھی منظور کریں گی جو خلاف شرع ہوں، لیکن یہ اندیشہ تو ہر صورت میں ہے خواہ مسلمان انتخابات میں حصہ لیں یا نہ لیں، لیکن اگر اسمبلی میں مسلم ممبران موجود ہوں تو اسلام اور مسلمانوں سے متعلق پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا وہ دفاع کرسکیں گے، بحیثیت اقلیت

مسلمانوں کو ملنے والے حقوق کے لیے آواز اٹھا سکیں گے،اور خلاف شرع پاس ہونے والے بلوں کے خلاف احتجاج کر سکیں گے،لیکن حصہ نہ لینے کی صورت میں ان میں سے کوئی بات حاصل نہ ہو سکے گی، اور بڑے بڑے قومی نقصانات کو برداشت کرنا پڑے گا، اس لیے یہ کوئی دانشمندی نہیں کہ چھوٹے خطرات سے بچنے کے لیے امت کو بڑے خطرات میں ڈالدیا جائے،

(۳)ایک تیسرا قاعدہ: اعتبار الذرائع النظر فی المآلات .

ترجمہ : ذرائع اور مسائل میں نتائج کا اعتبار رہوتا ہے۔

یہ قاعدہ فقہیہ ،کتب اصول میں مذکور نہیں ہے لیکن فقہاء کی رائے فقہی مباحث اور حضرت عمرؓ کی ایک رائے سے ماخوذ ہے جس میں فاروق اعظمؓ نے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو نوعروس یہودیہ کو طلاق دینے کا حکم دیا، جب کہ کتاب وسنت سے یہودیہ سے نکاح کا جواز ثابت ہے،مگر نتائج کا لحاظ کر کے حضرت عمرؓ نے یہ حکم فرمایا(الفاروق شبلی ص۸۶)

حضرت ابن تیمیہؒ کی ایک تحریر سے اس قاعدہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اذا خیر الامام بین قائد للجیوش ذی خبرة بالحرب وشجاعة فی الاقدام لکنه فاسق وآخر ورع تقی لا خبرة له بالحرب لوجب علی الامام ان یختار الاول لان قوته فی الحرب للمسلمین وفسقه علی نفسه

(السیاسة الشرعیة لابن تیمیه ص۵)

ترجمہ : اگر امام دو فوجی رہنماؤں میں سے ایک کو منتخب کرنا چاہے جن میں ایک ذاتی زندگی میں فاسق ہو،مگر امور حرب میں زیادہ تجربہ ومعرفت رکھتا ہو،اور بہادر ہو، جب کہ دوسرا شخص متقی اور دیندار ہو،مگر امور حرب سے اتنی واقفیت نہ رکھتا ہو،تو امام پر لازم ہے کہ وہ پہلے شخص کا انتخاب کرے، اس لیے کہ اس کا فسق اس کی ذاتی زندگی تک محدود ہے، جب کہ اس کی جنگی مہارت سے تمام مسلمانوں کو نفع پہونچے گا''۔

علامہ عزالدین بن عبدالسلام کی تحریر اس سلسلے میں کافی اہم ہے۔

تجوز الاعانة علی المعصیة لانکو نها معصیة بل لکو نها وسیلة

لتحصيل المصلحة الراجحة اذا حصل بالاعانة مصلحة تربو على تفويت المفسدة كما تبذل الاموال فی فداء الاسری الاحرار من المسلمين من ايدی غيرهم(قواعد الاحکام للعزبن عبد السلام ج۱ص۸۷)

ترجمہ: بعض حالات میں معصیت کا تعاون کرنا جائز ہو جاتا ہے، اس کی معصیت ہونے کی بنیاد پر نہیں بلکہ نیک مصالح کے حصول کا وسیلہ ہونے کی بنیاد پر، بشرطیکہ اس مفسدہ کو گوارا کرنے کے بعد کوئی بڑی مصلحت حاصل ہونے کی امید ہو، جس طرح کہ مسلم قیدیوں کی رہائی کے لیے مال خرچ کرنے کی اجازت ہے (حالانکہ بظاہر اس میں کفار کا مالی تعاون ہے لیکن مسلم قیدیوں کی رہائی جیسے بڑے نفع کے حصول کے لیے یہ نقصان برداشت کرنے کی اجازت ہے) اس کی ایک دوسری مثال علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے یہ دی، کہ اگر کوئی شخص جان بچانے کے لیے ظالم کو مال دے تو اس کی گنجائش ہے اس لیے کہ اعتبار نتیجہ کا ہے وسیلہ کا نہیں، مال خرچ کرنا محض وسیلہ ہے، (ج۱ص۱۲۹)

اس طرح انتخاب میں حصہ لینا معصیت کا سبب بنتا ہو لیکن اس کو عظیم قومی مفادات کے حصول کے لیے وسیلہ کے طور پر اختیار کیا جائے، تو ایسی حالت میں اعتبار نتائج کا ہوگا، وسائل کا نہیں۔

(۴) ایک مشہور فقہی ضابطہ ہے: **الامور بمقاصدها** (الاشباہ والنظائر)

ترجمہ: امور میں مقاصد کا اعتبار ہے۔

اس کے مطابق انتخاب میں حصہ لینے کا مقصد اس معصیت میں شراکت داری نہیں ہوتی جن کی قومی یا ریاستی اسمبلیاں مرتکب ہوتی ہیں بلکہ اس کا مقصد مسلمانوں کی نمائندگی اور ان کے حقوق ومسائل کے لیے جدوجہد ہوتا ہے، اس لیے اعتبار مقاصد کا ہوگا، ضمنی معصیتوں کا نہیں۔

اسی طرح مسلم قیدیوں کی رہائی کے لیے جو ہدایات اسلام میں دی گئی ہیں، ان سے بھی اس باب میں رہنمائی ملتی ہے کہ مسلمانوں کے عمومی مفادات کی اہمیت بعض جزوی مسائل

سے زیادہ ہے جہاں مسئلہ بحیثیت اجتماع یا بحیثیت قوم درپیش ہو وہاں یہ دیکھنا درست نہ ہوگا کہ مالی طور پر یا کسی اور ذیلی قسم سے کیا نقصان پیش آسکتا ہے۔

بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اطعموا الجائع وعودوا المريض

(بخاری، کتاب الجهاد، باب فكاك الاسير رقم ۳۰۴۶)

ترجمہ: بھوکے کو کھانا کھلاؤ، بیمار کی عیادت کرو۔

حضرت امام ابو یوسفؒ نے حضرت فاروق اعظمؓ کا قول نقل کیا ہے کہ

لان استنقذ من المسلمين من ايدى الكفار احب الى من جزيرة العرب (الخراج لابی یوسف ص ۱۹۶)

ترجمہ: کفار کے قبضہ سے کسی ایک مسلمان قیدی کو رہائی دلانا میرے نزدیک پورے جزیرۃ العرب سے زیادہ قیمتی ہے۔

اسی لیے تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ مسلم قیدیوں کی رہائی کی جدوجہد کرنا فرض ہے، خواہ اس کے لیے سرمایہ بیت المال سے حاصل کیا جائے یا عام مسلمانوں سے لیا جائے۔

ملاحظہ ہو: القواعد لابن رجب الحنبلی ۱۳۷/، قاعدہ ۷۵/ المغنی لابن قدامہ ج ۸ ص ۲۴۵/، مجموع الفتاوی لابن تیمیہ ج ۲۹ ص ۱۸۳-۱۸۴/، کشف القناع للبھوتی ج ۳ ص ۱۳۹/، نہایۃ المحتاج للرملی ج ۸ ص ۱۰۱-۱۰۲/، الاشباہ والنظائر للسیوطی ص ۹۶/، اور العقد المنظم للحکام لابن سلمون الکتانی المالکی ج ۲ ص ۱۸۵-۱۸۶)

اب اگر اس ذیل میں مال لینے والا کسی خیانت یا معصیت کا مرتکب ہو تو اس کی بنا پر اس عظیم کام کے لیے مالی تعاون، یا سیاسی جدوجہد ترک نہیں کی جائے گی، بلکہ عظیم تر مقاصد پر نگاہ کرتے ہوئے غلطیوں اور نقصانات کو نظر انداز کیا جائے گا، (کما فی قواعد الاحکام للعزبن عبدالسلام ج ۱ ص ۱۲۹)

معاصر علماء کی رائے:

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر عصر حاضر کے بہت سے عرب علماء نے غیر اسلامی ملکوں کے جمہوری انتخابات میں بحیثیت امیدوار حصہ لینے کے جواز کا فتوی دیا ہے، بشرطیکہ امیدوار صاحب ایمان، صاحب اثر، صاحب رائے اور معتبر شخصیت کا حامل ہو، اور اس انتخابی عمل کے ذریعہ مسلم اقلیت کی خیر خواہی، اور اس کے حقوق کا حصول اس کے پیش نظر ہو۔

(دیکھئے: مجلہ: الازهر : شمارہ: دسمبر، جنوری، ۲۰۰۱ء، مقاله الد يمقراطيه ومشاركة المسلم فى الانتخابات ، للدكتور عبد الكريم زيدان ص۳۶-۳۸، یہ مقالہ رابطہ عالم اسلامی کے ایک مؤتمر منعقدہ ۲۱ شوال ۱۴۲۲ھ میں بمقام مکہ مکرمہ پیش کیا گیا تھا)

ان احادیث و آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے وقت جبکہ اچھے لوگ مناسب عہدوں کے لئے نہ ملیں زوال و انتشار کا دور ہو، اور اچھے لوگوں کے آگے نہ بڑھنے سے قومی مفادات کے نقصان کا اندیشہ ہو تو اچھے لوگ جن کے اندر سیاسی شعور بھی ہو، اور قومی خدمت کی ہمت رکھتے ہوں ان کو چاہئے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے جمہوری حقوق سے استفادہ کرتے ہوئے خلافِ شرع امور پر نکیر بھی کرتے رہیں۔

ووٹ کی شرعی حیثیت

یہ تو خواص کی ذمّہ داری ہے جو قومی قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں، عام لوگ جو حق رائے دہی کا استعمال کر سکتے ہیں ان حالات میں ان پر بھی کچھ ذمّہ داریاں آتی ہیں، سب سے اول تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ جن ہاتھوں میں ملک کے اقتدار کی باگ ڈور دینے جا رہے ہیں یا جن کو اپنا نمائندہ چن رہے ہیں وہ فی الواقع اس منصب کے اہل ہیں یا نہیں، وقتی مفادات یا ذاتی رنجشوں کی بنا پر قومی سطح کے اس اہم ترین مرحلے پر ناانصافی برتنا ایک بدترین جرم ہے، ــــ قرآن نے بار بار عدل اور توازن کی تلقین کی ہے، اور اس کو معیار تقویٰ قرار دیا ہے۔

اعدلوا هو اقرب للتقوى (مائدہ : ۷)

ترجمہ : عدل کا معاملہ کرو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے''

علامہ ابن تیمیہ نے حضرت عمر بن الخطاب کی ایک حدیث نقل کی ہے جو موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طرح مروی ہے۔

من قلد رجلا على عصابة وهو يجد في تلك العصابة من هو ارضىٰ منه فقد خان الله وخان رسوله وخان المؤمنين فالواجب انما هو الارضىٰ من الموجود (وظيفة الحكومة الاسلامية ، لابن تيميه: ۱۲)

ترجمہ : جو شخص کسی جماعت پر کسی ایسے شخص کو ذمّہ دار بنا دے جس سے بہتر لوگ اس جماعت میں موجود ہوں تو اس نے اللہ، رسول، اور اہلِ ایمان کے ساتھ خیانت کی، اس لئے واجب ہے، کہ موجودہ لوگوں میں جو سب سے بہتر شخص ہو اس کا انتخاب عمل میں آئے''۔

اس موقعہ پر ووٹ یا حقِ رائے دہی کی شرعی حیثیت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ووٹ کی تین حیثیتیں متعین کی ہیں۔

(۱) ایک حیثیت شہادت کی ہے، یعنی ووٹ دینے والا شخص متعلقہ شخص کے بارے

میں اس کی اہلیت وقابلیت، دیانت وامانت اور صدق وخلوص کی شہادت دیتا ہے۔

اس لحاظ سے اس پر شہادت کے احکام مرتب ہوں گے اور اصولِ شہادت کے مطابق جھوٹی شہادت دینا بدترین جرم ہے، اس کو شرک کے ساتھ گناہِ کبائر میں شمار کیا گیا ہے۔

(متفق علیه، نیل الاوطار:۸/۵۶۵)

(۲) ووٹ کی دوسری حیثیت سفارش کی ہے، یعنی ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، اس لحاظ سے قرآن نے سفارش کا جو اصول بیان کیا ہے اس کی رعایت ضروری ہوگی۔

من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها (النساء:۸۵)

ترجمہ: ''جو اچھی سفارش کرے گا اس کو اس میں سے حصہ ملے گا، اور جو بُری سفارش کرے گا وہ بھی اس میں حصہ دار ہوگا''۔

اچھی سفارش یہ ہوگی کہ قابل اور دیانتدار آدمی کی سفارش کرے، جو خلقِ خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور بُری سفارش یہ ہے کہ نااہل نالائق، فاسق ظالم شخص کی سفارش کر کے خلقِ خدا پر اس کو مسلط کرے۔ اس اعتبار سے ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا اُمیدوار اپنے پنج سالہ دور میں جو نیک یا بدعمل کرے گا ووٹر بھی اس کا شریک سمجھا جائے گا۔

(۳) ووٹ کی تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو ملک و قوم کے حقوق عامہ میں اپنا نمائندہ اور وکیل قرار دیتا ہے، اور اصول وکالت کے مطابق وکیل کے تمام اچھے اور بُرے تصرفات مؤکل کی طرف لوٹتے ہیں، اس لحاظ سے کامیاب ہونے والے امیدوار کے ہر اچھے اور بُرے کام کا ذمّہ دار خود ووٹر بھی قرار پائے گا۔

(جواهر الفقه: ج۲/ص۲۹۱ تا ۲۹۳)

(۴) اور میرے نزدیک ایک چوتھی حیثیت رائے اور مشورہ کی بھی ہے، جیسا کہ حق رائے دہی کی اصطلاح سے مترشح ہوتا ہے یعنی انتخابی کمیشن جس کو ملک کا سربراہ اور اس کے رفقاءِ کار چننے کا اختیار دیا جاتا ہے، وہ سارے ملک کے عوام سے اس بارے میں مشورہ لیتا ہے،

اوران کواختیار دیتا ہے کہ وہ مختلف امیدوار جو میدان میں موجود ہیں، ان میں سے کسی ایک کے بارے میں اپنی رائے دیں کہ کون شخص ملک کے لئے بحیثیت حاکم یا بحیثیتِ معاون حکومت زیادہ موزوں ہے؟ اور ووٹرز بلیٹ پیپر پر اپنے اس حق رائے دہی کا استعمال کرتے ہیں، اور انتخابی بورڈ کو رازدارانہ طور پر اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے مشورہ اور رائے کا جو ضابطہ ہے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا، احادیث میں مشورہ اور رائے کو امانت قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرةؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المستشار مؤتمن(رواہ الترمذی ، مشکوٰۃ :۴۳۰)

ترجمہ : یعنی جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہوتا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

المجالس بالامانۃ(رواہ ابو داؤد ، مشکوٰۃ:۴۳۰)

مجلسیں امانت ہوتی ہے یعنی جس مجلس میں کسی موضو.ع پر نجی گفتگو کی جائے، تبادلۂ خیال کیا جائے، یا مشورہ کیا جائے وہ امانت ہوتی ہیں۔

اور امانت کے بارے میں قرآن کا حکم ہے:

ان اللّٰہ یأمر کم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا (النساء :۵۷)

ترجمہ : بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے حوالہ کرو۔

اس لحاظ سے ووٹر کو اپنی اہلیت امانت بھی ثابت کرنی ہوگی اور جس کے حق میں رائے دے رہا ہے وہ فی الواقع اس کے نزدیک اس لائق ہے اس کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا اسی طرح جس بوتھ پر اس نے اپنے حق کا استعمال کیا ہے، اس کو امانت تصور کرے اور اس کا علم ضروری حد تک دوسروں کو نہ ہونے دے، اس لئے کہ مجلسیں امانت ہوتی ہیں اور الیکشن کے دوران اپنی رائے کی تشہیر سے فتنہ کا اندیشہ ہے، اور مجلسوں کو اسی مقصد سے امانت کہا گیا ہے۔

ووٹ دینے کا حکم:

گویا ووٹ کی شرعی طور پر چار حیثیتیں ممکن ہیں،شہادت ، شفاعت ، وکالت ، اور مشورہ،شہادت کے نقطۂ نظر سے ووٹ دیناواجب ہے اس لئے کہ قرآن نے سچی شہادت کو لازم قرار دیا ہے۔

کونو قوامین لله شهداء بالقسط (مائدہ:۷)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ،(نساء :۱۲۵)

ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں،تیسری جگہ سورۂ طلاق میں ارشاد ہے۔

واقیموا الشهادة لله(طلاق)

اوراللہ کے لئے سچی شہادت کوگناہ قرار دیا گیا ہے۔

ولا تکتموا الشهادة ومن یکتمها فانه آثم قلبه(آل عمران : ۲۸۲)

یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ جوشہادت کو چھپائے گا اس کا دل گناہ گار ہے۔

اس طرح قرآن کے اصول شہادت کے مطابق اگر ووٹر پر کسی ایک امیدوار کی اہلیت اورصداقت ودیانت منکشف ہوجائے اوراسے شرح صدر ہو کہ دوسروں کے مقابلے میں یہ زیادہ بہتر صلاحیت کا حامل ہے،تو اس کی شرعی ذمّہ داری ہے کہ وہ اس ادائیگیٔ شہادت میں پیچھے نہ ہٹے اورایسی صورت میں ووٹ نہ دینے پر وہ گناہ گار ہوسکتا ہے،البتہ کسی ایک طرف رجحان قائم نہ ہو،اورکسی کے بارے میں شرح صدر نہ ہوتو اس کے لئے گنجائش ہے کہ وہ مزید غور کرے اور کسی جانب رجحان ہونے تک اپنے آپ کوادائیگی شہادت سے باز رکھے۔

یہ حکم اس صورت میں ہے جب ووٹ کوشہادت تصور کیا جائے لیکن اس کی دوسری حیثیتوں (شفاعت وکالت اورمشورہ) کے لحاظ سے کسی اچھے امیدوار کے حق میں ووٹ دینا زیادہ سے زیادہ امرِ مستحب قرار پاتا ہے۔مگراس سے جونتائج مرتب ہوتے ہیں،اوران سے جو عظیم تر قومی اوراجتماعی مفادات متعلق ہوتے ہیں،ان کے پیشِ نظر ووٹر پر یہاں بھی یہ ذمّہ

داری عائد ہوتی ہے، کہ وہ اپنے ووٹ کا استعمال ضرور کرے، البتہ یہ حکم چوں کہ ووٹ کی اصل حیثیت کے لحاظ نہیں ہے بلکہ اس کے نتیجہ کے لحاظ سے ہے، اس لئے اس لزوم کا درجہ شہادت کے مقابلے میں کمتر ہوگا۔

غرض ووٹ کی چار حیثیتوں میں ایک حیثیت کے لحاظ سے ووٹ دینا واجب معلوم ہوتا ہے، خواہ اس کے ثمرات کچھ بھی ہوں، اور باقی تین حیثیتوں کے لحاظ سے اصلاً ووٹ دینا واجب نہیں ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ مستحب ہے، لیکن ثمرات کے لحاظ سے اس کی اہمیت بڑھ سکتی ہے، یعنی اس پر وجوب یا عدمِ وجوب کا حکم اس کے ثمرات پر مبنی ہے، لیکن بطور قدر مشترک یہ حکم بہر حال مستنبط ہوتا ہے کہ جمہوری انتخابات میں ووٹ دینے والا شخص نہ دینے والے کے مقابلے میں شریعت کے نزدیک زیادہ بہتر اور لائق تحسین ہے۔

امیدوار کے انتخاب کا معیار:

البتہ یہاں اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ انتخاب لڑنے والے دو طرح کے امیدوار ہوتے ہیں بعض وہ ہوتے ہیں جو کسی سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے انتخاب میں اترتے ہیں، اور بعض آزاد امیدوار ہوتے ہیں، آزاد امیدواروں میں فیصلہ ان کی ذاتی زندگی، عادات واطوار اور مسلمانوں کے حق میں ان کے نظریات وخیالات سے کیا جائے گا، جو امیدوار مجموعی طور پر بہتر نظر آئے اس کو ووٹ دیا جائے گا۔

البتہ جو لوگ کسی سیاسی جماعت کے نمائندہ کی حیثیت سے میدان میں اترتے ہیں، ان میں بنیادی طور پر اس سیاسی جماعت کی پالیسی، انتخابی منشور، اور اس کے ہائی کمان کے خیالات ونظریات کا اعتبار ہوگا، جس کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ میدان میں اترے ہیں، اس لئے کہ اس صورت میں شخصی کامیابی دراصل پارٹی کی کامیابی متصود ہوتی ہے، اور تشکیلِ حکومت کے وقت شخصی خیالات سے زیادہ پارٹی کے منشور اور اس کے اصولوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لئے اس صورت میں کسی فرد کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا، فرد صرف آلۂ کار ہوتا ہے اور وہ پابند ہوتا ہے کہ جماعت کے اصولوں اور اس کے خیالات سے انحراف نہ کرے، کسی بھی انحراف کی

صورت میں ممبر کا پارٹی میں وجود مشکل ہوجاتا ہے، اس لئے ایسی صورت میں کسی ایسی سیاسی جماعت کا نمائندہ جو مسلمانوں کے ساتھ متعصّبانہ نظریات رکھتی ہو، خواہ کتنا ہی شریف النفس اور صاف ذہن محسوس ہو اور خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اس کو ووٹ دینا ہرگز روا نہ ہوگا، اور نہ اس قسم کی جماعتوں میں کسی مسلمان کو شمولیت کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

بلکہ اس کے بالمقابل کسی ایسے امیدوار کو ووٹ دینا ضروری ہوگا، جو کسی ایسی سیاسی جماعت کا نمائندہ ہو جو مسلمانوں کے حق میں نسبتاً معتدل نظریات کی حامل ہو، یا کسی ایسے آزاد امیدوار کو جو اپنے عادات واطوار اور نظریات وخیالات کے لحاظ سے بہتر شخص ہو خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر فقہی لحاظ سے دو طرح سے غور کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ایک اس طور پر کہ وہ مسلمان امیدوار جو کسی متعصب جماعت کا نمائندہ بن کر آیا ہے اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے، فقہاء نے نمائندہ یا وکیل کو متعلقہ معاملات میں موکل اور اصیل کا پابند بنایا ہے، اور اس کی اجازت سے کئے جانے والے تمام تر تصرفات کا ذمّہ دار مؤکل واصیل کو قرار دیا ہے، کتاب البیوع، کتاب النکاح اور کتاب الصلح وغیرہ میں اس نوع کی بہت سی جزئیات موجود ہیں۔

وکالت کی تعریف ہی فقہاء نے ان الفاظ میں کی ہے۔

الوکالۃ ھی تفویض احد امرہ لآخر واقامتہٗ مقامہ

(در مختار کتاب الوکالۃ: ج۲، ص۱۰۳)

یعنی اپنا کام دوسرے کے حوالہ کردینے اور دوسرے کو اپنا قائم مقام بنا دینے کا نام وکالت ہے۔

(۲) دوسرے اس طور پر کہ فقہاء نے امان کی بحث کے تحت لکھا ہے کہ عبد مجور اگر حربی کو امان دے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کے امان کا اعتبار نہ ہوگا، اگرچیکہ وہ دارالاسلام میں آنے کے بعد مسلمان ہوچکا ہو، البتہ آزاد ہوجائے اور دارالاسلام ہی میں اقامت اختیار کرلے تو اس کے امان کا اعتبار ہوگا، اس لئے کہ آزادی ملنے کے بعد باوجود قدرت دارالحرب نہ جانا

اور دارالاسلام میں اقامت اختیار کرنا بظاہر مسلمانوں کے ساتھ اس کی محبت وخیر خواہی کی دلیل ہے، چاہے فی الواقع اس کے اندر محبت و خیر خواہی نہ ہو، اور اس نے در حقیقت کافروں کے نمائندہ اور جاسوس کی حیثیت سے یہاں رہنا منظور کیا ہو، اور اس کا اسلام محض دکھاوا ہو، لیکن شریعت میں ظاہر کا اعتبار کیا جاتا ہے، جب تک کہ اصلیت پر معتبر ثبوت نہ مل جائے، اس کے بر خلاف جو عبد مجور حالتِ غلامی میں اسلام قبول کرے، اور کسی حربی کو پناہ دے، اس کی حالت بظاہر مشتبہ ہے اس لیے کہ اس کے نسلی اور برادرانہ روابط دار الحرب سے قائم ہیں اس لیے اس سے یہ توقع رکھنا غلط ہے کہ وہ اپنے دارالحرب کے مفادات پر مسلمانوں کے مفادات کو ترجیح دے گا، قبولِ اسلام ایک ظاہری علامت اس بات کی بن سکتا تھا کہ بحیثیت مذہب وہ مسلمانوں کے مفادات کو ترجیح دے گا، لیکن حجر اور غلامی کی حالت میں قبول اسلام کا درجہ بخوشی قبول اسلام کی طرح نہیں ہے، زیادہ امکان اس کا ہے کہ اس نے حالات کے دباؤ میں محض اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اسلام قبول کیا ہو، اس لئے حربیوں کو امان دینے کے معاملہ میں اس اسلام کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ اس باب میں وہ تہمت وشک کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔

قاضی ابوزید دبوسی لکھتے ہیں :

ان امان العبد المحجور لایجوز عنده...... لانه متهم فی الامان فلا یجوز قیاسا علی الذمی و وجه التهمة ان العبد له قرابة وعشیرة فی دارالحرب فیؤثر هما علی المسلمین فصار کالذمی ولایلزم علی هذا مالوا عتق ثم آمن لانه اعتق واطلق وزالت یدالمولیٰ عنه و اختیار المقام فی دارنا مع قدرته علی العود الی دارالحرب فقد ارتفعت التهمة ...... فان قیل فیستدل باسلامه علی انه یؤثر منفعة المسلمین علی الکفار قیل له بنفس الاسلام لایستدل لانه مکره علی ذلک والاکراه یمنع تحقیق ما اکره علیه

(تاسیس النظر :۲۱، مطبوعہ المطبعۃ الادبیۃ مصر)

یہاں سیاسی پارٹیوں کے مسلم امیدواروں پر اگر چہ حجر کا اصطلاحی اطلاق نہیں

ہوسکتا، لیکن پارٹی کے ساتھ حلف وفاداری اور اکثریتی دباؤ کی بنا پر وہ جس نوع کی وفاداری کے پابند ہوتے ہیں، اس حالت میں ان کے اندر کا اسلام پارٹی کی سطح پر جذبہ کے لحاظ سے اتنا کمزور ہو جاتا ہے، کہ وہ مسلمانوں کے مفادات کے لئے کچھ نہیں کر سکتے، اور وہ مسلمان ہونے کے باوجود مسلمانوں سے زیادہ پارٹی کے مفادات کو عزیز رکھنے پر مجبور ہیں، اس لئے کسی امیدوار کی شرافت نفس یا اس کی مسلمانی پارٹی کے اصولوں سے ہرگز اس کو الگ نہیں کر سکتی۔ اور اگر بالفرض اس کے بیچ کوئی مضبوط مسلم یا شریف النفس امیدوار اپنی وجاہت ورسوخ کی بنا پر پارٹی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی رکھے تو متہم تو وہ بہر حال ہے، اور دلیل ظاہر کے لحاظ سے پارٹی میں رضا کارانہ شمولیت اس تہمت کو تقویت دیتی ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے اصول پر متعصّبانہ یا حربی نظریات رکھنے والی جماعت کے معاملے میں تہمت بھی حقیقت کا درجہ رکھتی ہے، اور کسی کی ذاتی شرافت یا مسلمانی اس تہمت کو اس سے رفع نہیں کر سکتی۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل اعتبار اس سیاسی جماعت کا ہے جس کا کوئی شخص امیدوار بنتا ہے نہ کہ امیدوار کی ذاتی زندگی اور خیالات کا۔

سیاسی جماعتوں سے اتحاد کا اصول

انتخابات کے موقعہ پر مختلف سیاسی پارٹیاں مختلف مفادات کے تحت ایک دوسرے سے معاہدات کا سلسلہ بھی شروع کرتی ہیں، ایسے موقع پر اگر کوئی مسلم سیاسی جماعت کسی غیر مسلم سیاسی جماعت سے ملّی مفادات کے تحت بعض معاہدات کرنا چاہے تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، خواہ وہ غیر مسلم سیاسی جماعت سخت گیر اور متعصّبانہ نظریات ہی کی حامل کیوں نہ ہو، بشرطیکہ مسلم جماعت یا مسلم امیدواروں کا سیاسی تشخص اور ملی وقار مجروح نہ ہو، اور معاہد جماعت اپنے انتخابی منشور سے ان سخت گیر، اور متعصّبانہ نظریات کو خارج کرنے پر آمادہ ہو جو مسلمانوں کے مفادات سے متصادم ہوں، اور مشترکہ بنیادوں پر انتخاب لڑنے کے لئے تیار ہو۔ اسی طرح اگر کوئی سیکولر (یعنی مسلمانوں کے حق میں نسبتہً معتدل نظریات کی حامل سیاسی) جماعت بعض سخت گیر غیر مسلم جماعتوں سے مشترکہ بنیادوں پر باہم اتحاد قائم کرے اور سخت گیر جماعت اپنے اعلامیہ سے اپنے منفی نظریات سے دستبرداری کا اعلان کرے، تو ایسی صورت میں اس اتحاد کی حمایت کی جاسکتی ہے، اور اس سطح سے انتخاب لڑنے کی بھی اجازت دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس کے بالمقابل کوئی خالص مسلم یا سیکولر جماعت موجود نہ ہو اور اس اتحاد سے سخت گیر جماعت کو بحیثیت جماعت تقویت نہ ملتی ہو۔

اس سلسلے میں یہ آیتِ کریمہ بنیاد بن سکتی ہے۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم الآیة

(آل عمران:۶۳)

ترجمہ: ''اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسی بنیاد پر جمع ہو جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے''۔

اس آیتِ کریمہ میں یہودیوں کو ایک مشترکہ بنیاد پر جمع ہونے کی دعوت دی گئی ہے،

جب کہ مسلمانوں کے حق میں یہودیوں سے بڑھ کر سخت گیر تنظیم نہ اس دور میں تھی اور نہ آج ہے، خود قرآن نے ان کی عداوت وشدت کا ذکر کر کے ان کی عصبیت وتنگ نظری پر دائمی مہر لگا دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لتجدنّ اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا

(المائدة:۸۲)

ترجمہ: ''یقیناً تم کو (عملی زندگی میں) مسلمانوں کے سب سے بدترین دشمن یہود اور مشرکین ملیں گے''۔

لیکن اس کے باوجود ایک مشترکہ بنیاد پر ان کو متحد ہونے کی دعوت دی گئی، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے، کہ اگر مسلمانوں پر ایسے حالات آئیں جن میں ملی مفادات کے تحفظ کے لئے سخت عناصر سے مشترکہ بنیادوں پر معاہدہ کی ضرورت پڑے تو اس کی گنجائش ہوگی۔

عہدِ نبوی میں غیر مسلموں سے سیاسی اتحاد کے نمونے:

اور اس قسم کے اتحاد کی بعض عملی مثالیں عہدِ نبویؐ میں ملتی ہیں، جو مختلف حالات کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائے۔

(۱) معاہدۂ مدینہ:

تاریخی طور پر اس سلسلے کا سب سے پہلا اتحاد جس کو خود رسولؐ نے قائم فرمایا وہ ہجرتِ مدینہ کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کا اتحاد ہے، اور اس کے لئے جو دستور مرتب کیا گیا اس میں اکثر ان بنیادوں کا ذکر کیا گیا جن پر دونوں فریقوں کا اتفاق ممکن تھا، تاریخ الکامل، البدایۃ والنہایۃ، اور سیرت ابنِ ہشام وغیرہ میں یہ معاہدہ پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہاں بطورِ مثال صرف چند مشترکہ بنیادوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن پر میثاق کی اساس تھی۔

وان يهود بنی عوف امة مع المؤمنين

یہود اور مسلمانوں کا ایک اتحاد ہوگا۔

و ان بينهم النصر علی من حارب هذه الصحيفة

جو شخص اس میثاق کی مخالفت کرے گا اس کے خلاف دونوں ملکر کاروائی کریں گے۔

و ان بینهم النصح و النصیحة و البر دون الاثم

ان کے درمیان باہم ہمدردی اور خیر خواہی اور نیکی کا رشتہ ہوگا کسی ظلم و گناہ کا نہیں۔

و ان النصر للمظلوم .... مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

و ان بینهم النصر علی من دهم یثرب

مدینہ پر جو حملہ کرے گا اس کے خلاف دونوں ملکر کاروائی کریں گے۔

و اذا دعوا الی صلح یصا لحونه ویلبسو نه فانهم یصالحونه و یلبسونه

و انهم اذا دعوا الی مثل ذلک فانه لهم علی المؤمنین الامن حارب فی الدین

اگر یہود کو کسی ایسے معاہدہ کی پیش کش کی جائے جس پر اتفاق ممکن ہو تو وہ اس پیش کش کو قبول کریں گے اور اس طرح کے معاہدات میں جو طے ہوگا وہ مسلمانوں پر بھی نافذ ہوگا۔ الا یہ کہ خلافِ دین کوئی چیز طے کر لی جائے۔ (یعنی مشترکہ بنیاد کے بجائے کوئی امتیازی بنیاد اختیار کر لی جائے تو اس معاہدہ کا اطلاق اس پر نہیں ہوگا)۔ وغیرہ تقریباً ۴۷ دفعات ہیں جن کا تذکرہ میثاق مدینہ میں کیا گیا ہے، (سیرت ابنِ هشام :ج۱ص۱۷۷، شرح المواهب اللدنیه:ج۴، ص۱۶۸۔۱۶۹، الوثائق السیاسیة ڈاکٹر حمید اللّٰہ ص۵۷تا۶۴)

البتہ اس اتحاد میں مسلمانوں کی حیثیت ایک بالا دست قوت کی تھی اور متعدد اختلافی معاملات میں اللہ اور رسول کے فیصلہ کو آخری فیصلہ قرار دیا گیا تھا، اس لئے کہ یہ اتحاد مَدنی دَور میں قائم کیا گیا تھا اور مَدنی دَور مسلمانوں کے غَلبہ کا دَور ہے، لیکن فی الجملہ اس سے مشترکہ انسانی بنیادوں پر غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اتحاد کا جواز ملتا ہے۔

حلف الفضول:

اس قسم کا ایک بین القبائلی معاہدہ بعثتِ نبویؐ سے تقریباً بیس سال قبل جنگ فجار کے چار ماہ بعد مکہ میں ہوا تھا، جب حضور ﷺ کی عمرِ مبارک بیس سال تھی، آپ اس معاہدہ میں شعوری طور پر شریک تھے۔ اس کو "حلف الفضول" کہا جاتا ہے، ایک مخصوص واقعہ کے تناظر میں

امن وسلامتی، انسانی ہمدردی، مظلوموں کی مدد، ظالموں کا مقابلہ اور اس جیسی بعض مشترکہ بنیادوں پر بنو هاشم، زهره، تیم بن مرة، وغیرہ قبائل کے درمیان یہ اتحاد قائم ہوا (تفصیل کے لئے دیکھا جائے البدایة والنهایة: ج۲،ص۲۹۱، باب شهود النبی ﷺ حلف الفضول، اور احکام القرآن: للقرطبی، ج۶،ص۳۳)

ہمارے لئے زیرِ بحث مسئلہ میں اس اتحاد کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد اصل اہمیت رکھتا ہے، جو حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے مروی ہے۔

قال لقد شهدت فی دار عبد الله بن جدعان حلفًا ما احب ان لی به حمر النعم ولو ادعَی به فی الاسلام لاجبت (بیهقی: ج۶،ص۳۶۷ بیروت لبنان)

ترجمہ: حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس معاہدہ میں شریک تھا، یہ معاہدہ مجھے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے، اگر مجھے آج عہدِ اسلامی میں بھی اس قسم کے کسی معاہدہ کی دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا۔

یہ عہدِ اسلامی سے قبل کا معاہدہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس میں شریک قبائل مسلمان نہیں تھے، اور حضور ﷺ کا اس وقت نوعمری مگر مکمل شعور کا دور تھا، اس معاہدہ میں کسی معاہد فریق کی بالا دستی کا بھی سوال نہیں اٹھتا تھا، ایسے معاہدہ اور ایسے اتحاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرکارِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس قسم کے اتحاد کی دعوت مجھے آج بھی دی جائے تو میں بخوشی اس کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

اس کا مطلب ہے کہ مسلمانوں پر اگر ایسے حالات آجائیں جن میں وہ اپنے ملی تشخص، مفادات کے تحفظ اور دیگر نیک مقاصد کے لئے غیر مسلموں سے مشترکہ بنیادوں پر (جن میں کوئی بات خلافِ شریعت نہ ہو) اتحاد قائم کریں تو اس کی گنجائش ہے، بالخصوص غیر مسلم ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے ہوں۔

حلف خزاعہ کی تجدید:

اس طرح کا ایک معاہدہ عہدِ جاہلیت میں بنو عبد المطلب اور خزاعہ کے درمیان ہوا تھا، جس کو حلفِ خزاعہ کے نام سے جانا جاتا ہے، تاریخِ طبری وغیرہ میں واقعہ کی پوری تفصیل موجود ہے، اس معاہدہ کی اساس باہم نصرت ومحبت اور امن وسلامتی پر تھی، اس کی یہ دفعہ بطورِ خاص بہت اہم تھی۔

وان عبد المطلب و ولده ومن معهم ورجال خزاعة متكافئون متضافرون متعاونون على عبد المطلب النصرة لهم بمن تابعه على كل طالب وعلى خزاعة النصر لعبد المطلب و ولده ومن معهم على جميع العرب فى شرق اوغرب اوحزن اوسهل وجعلوا الله على ذلك كفيلاً

ترجمہ: ''عبد المطلب اور ان کی اولاد اور ان کے رفقاء اور قبیلہ خزاعہ کے لوگ باہم مساوی اور ایک دوسرے کے مددگار رہوں گے، عبد المطلب پر ان کی مدد ہر اس شخص کے مقابلے میں لازم ہوگی جن کے لئے ان کو مدد کی ضرورت ہو اس طرح خزاعہ پر عبد المطلب اور ان کی اولاد اور رفقاء کی مدد لازم ہوگی پورے عرب کے مقابلے میں، خواہ وہ مشرق ومغرب میں سخت زمین یا نرم زمین کہیں بھی ہوں، اور اس پر اللہ کو کفیل بناتے ہیں اور اس سے بہتر کوئی ضمانت نہیں''۔

اس معاہدہ کا علم رسول اللہ ﷺ کو تھا، صلح حُدیبیہ کے موقعہ پر قبیلۂ خزاعہ کے لوگ خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے اور معاہدہ نامہ کی ایک کاپی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کی، حضرت اُبَیّ بن کعب نے اس کا مضمون پڑھ کر سنایا، حضورؐ نے فرمایا تمہارا یہ معاہدہ برقرار رہے گا۔ اسلام عہدِ جاہلیت کے معاہدوں کو منسوخ نہیں کرتا، آپ نے اس معاہدہ کی تجدید فرمائی اور اس میں ایک دفعہ کا اضافہ فرمایا۔

ان لايعين ظالما وانما ينصر مظلوما

کہ ظالم کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی بلکہ مدد صرف مظلوم کی کی جائے گی۔(تاریخِ طبری:ص۱۰۸۴، الیعقوبی:ج۱ص۲۷۸،۲۷۹، بحواله الوثائق السياسية: ص۲۷۳-۲۷۴)

اہمیت محض معاہدہ کی نہیں ہے، عہدِ جاہلیت میں اس طرح کے قبائلی معاہدے ہوتے

رہتے تھے، اہمیت اس کی ہے کہ حضور نے باہم نصرت و محبت پر مبنی اس معاہدہ کی توثیق فرمائی، آپ کی توثیق کے بعد یہ شریعت کا حصہ بن گیا۔

غیر مسلموں سے جنگی اتحاد:

حضور ﷺ نے بعض جنگی مواقع پر غیر مسلموں سے دفاعی اتحاد قائم فرمایا، مثلاً بنو قریظہ کے مقابلے میں یہود بنو قینقاع سے فوجی مدد لی، صفوان بن اُمیّہ نے حُنین وطائف میں مسلمانوں کے ساتھ ملکر جنگ کی جبکہ وہ مشرک تھا، اگرچہ کہ بعض مواقع پر آپ نے مشرکین سے فوجی مدد لینے سے انکار بھی فرمایا ہے۔

(نیل الاوطار: ج ۷،ص ۱۲۷، بحواله احمد و مسلم)

آپ ﷺ کے ان دونوں طرح کے طرزِ عمل سے فقہاء نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کفار سے فوجی اتحاد صرف اس صورت میں قائم کیا جاسکتا ہے جب کہ اس میں درج ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

۱- اسلام اور مسلمان اس اتحاد میں بالا دست قوت کی حیثیت میں ہوں۔

۲- مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کا اشتراک ایسے معاملات تک محدود رہے جو فوجی رازوں سے متعلق نہ ہوں۔

۳- ان کا اشتراک مسلمانوں کے قومی مصالح کے خلاف نہ ہو۔

۴- مسلمانوں پر آئندہ ان کے احسان جتلانے کا اندیشہ نہ ہو۔

۵- مسلمانوں کے اندر غیر مسلموں کے اشتراک سے فاتحانہ قوت کا احساس بیدار نہ ہو بلکہ سارا توکل اللہ پر ہو۔

۶- مسلمانوں کو فی الواقع اس قسم کے اتحاد کی ضرورت ہو۔

ان شرائط کے ساتھ غیر مسلموں سے فوجی اتحاد قائم کرنا امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ (شرح السیر: ج ۳،ص ۱۸۶، رد المحتار ج ۶،ص ۲۴۲، کتاب الام: ج ۴،ص ۸۹-۹۰)

انتخاب بھی اس دور میں ایک طرح کی جنگ ہے، اگر کسی سخت گیر متعصب ذہنیت رکھنے والی جماعت کو پیچھے ڈھکیلنے یا خود اس کو اپنے سخت گیر نظریات سے دستبردار کرنے کے لئے کسی صاف ذہن سیکولر سیاسی جماعت سے اتحاد قائم کیا جائے یا اس کے اتحاد کا تعاون کیا جائے تو مذکورہ بالا شرائط کے مطابق اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے"۔

کسی غیر مسلم سیاسی جماعت کا تعاون

البتہ مشکل اس وقت پیش آئے گی جب مسلمانوں کے پاس کوئی مضبوط سیاسی جماعت نہ ہو جس سے غیر مسلم سیاسی جماعتیں اتحاد کرنے کے لئے تیار ہوں، یا اگر بمشکل تیار ہو بھی جائیں تو مسلم سیاسی جماعت ایک کمزور رفیق کی حیثیت سے اس میں شامل ہو اور بالا دستی غیر مسلم سیاسی جماعت کو حاصل ہو، یا یہ کہ سرے سے مسلمانوں کے پاس کوئی سیاسی جماعت ہی نہ ہو جس کے پلیٹ فارم سے مسلمان امیدوار انتخاب لڑسکیں، بلکہ میدان میں ساری جماعتیں غیر مسلموں کی ہوں، اور مسلمان ان میں سے کسی ایک جماعت سے سیاسی اتحاد کرنا چاہیں بایں طور کہ کچھ مسلمان امیدواروں کو وہ سیٹ دے، اور مسلمان اس کو ووٹ دیں، اس صورت میں بھی مسلمانوں کی بالا دستی کی شرط پوری نہیں ہوتی ہے، جب کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں مسلمانوں کو زیادہ تر اسی قسم کے سمجھوتے یا اتحاد کی ضرورت پڑتی ہے، جہاں چند علاقوں کا استثناء کر کے مسلمانوں کی کوئی قابلِ ذکر سیاسی جماعت موجود نہیں ہے، فقہاء کے یہاں اس سلسلے میں بہت زیادہ صراحت تو نہیں ملتی البتہ عہدِ نبویؐ کے چند واقعات اور بعض فقہی اشارات سے اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

حبشہ میں حضرت زبیر کا میدان جنگ کی طرف نکلنا:

مسلمانوں کے قیام حبشہ کے دَور میں نجاشی کے کسی دشمن نے حبشہ پر چڑھائی کر دی، نجاشی بہت متفکر ہوا اور جنگ کے لئے نکلا، ادھر جو مسلمان حبشہ میں مقیم تھے وہ اور بھی زیادہ متفکر تھے، ان کو فکر اپنے ملی وجود اور تشخص کی تھی کہ نجاشی کے عہدِ حکومت میں ان کو جو مذہبی مراعات حاصل تھیں، وہ دوسری حکومت میں باقی رہیں کہ نہ رہیں، اس وقت کی کیفیت اُم المومنین حضرت اُمِّ سلمہؓ بیان کرتی ہیں جو اس وقت اپنے سابق شوہر حضرت ابوسلمہ کے نکاح میں تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھیں، فرماتی ہیں۔

" فو الله ما علمنا حزنا قط كان اشد من حزن حزناه عند ذلک تخوفا ان يظهر ذلک الرجل على النجاشي فياتي رجل لايعرف من حقنا ما كان النجاشي يعرف منه "

ترجمہ: اللہ کی قسم ایسا شدید غم ہمیں کبھی نہیں ہوا، جیسا اس موقع پر ہوا، سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا تھا، کہ نجاشی کے دشمن کا سلوک ہمارے ساتھ اتنا اچھا نہ ہوگا جتنا اچھا نجاشی کا ہے۔

پھر مسلمانوں نے باہم مشورہ کے بعد طے کیا کہ مقامِ جنگ پر ہم میں سے کسی کو جانا چاہئے، تاکہ نمائندگی بھی ہو اور ہمیں جنگ کی صحیح صورتِ حال کا بھی علم ہوتا رہے، حضرت زبیر بن العوام جو اس قافلۂ حبشہ میں سب سے کم عمر تھے، جانے کے لئے تیار ہوئے، اور دریائے نیل تیر کر کے میدانِ جنگ میں پہونچے، ادھر جو لوگ یہاں موجود تھے وہ اللہ سے نجاشی کی فتح کے لئے دعاؤں میں مصروف ہوگئے، بالآخر نجاشی کو فتح ہوئی اور حضرت زبیر کی اس شرکت سے نجاشی کے نزدیک ان کا اعتبار بڑھ گیا۔

(سیرت ابن هشام:۱/۱۸۳، البداية والنهاية:۳/۸۷مطبوعہ قاہرہ)

اس واقعہ کی سند صحیح ہے البتہ بعض علماء نے اس واقعہ کے ذیل میں یہ کلام کیا ہے کہ حضرت زُبیر کی شرکت جنگ کے ارادہ سے نہیں تھی بلکہ صرف حالات کا علم حاصل کرنے کے لئے تھی، اور اگر قتال کے ارادہ سے بھی ہو تو حضور اکرم ﷺ کو اس کی خبر ملی یا نہیں؟ اور آپ نے اس پر کیا فرمایا اس کا کوئی علم نہیں ہے، پھر اس کا بھی امکان ہے کہ نجاشی اس وقت تک مسلمان ہو چکا ہو اس لئے اس واقعہ میں یہ طے نہیں ہے کہ حضرت زُبیرؓ نے کافر کے جھنڈے تلے جنگ میں حصہ لیا، کافروں کی دو جماعتوں میں سے ہر ایک حزب الشیطان ہے، اس لئے کسی کی مدد کرنا حزب الشیطان کی مدد کرنا ہے، اور مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں۔

(السير الكبير للامام محمد:۳/۱۸۷، بحواله اعلاء السنن:۱۳/۶۰، ۶۱)

واقعۂ حبشہ سے استدلال کی صحیح نوعیت:

لیکن اس واقعہ میں کئی لحاظ سے مزید غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(الف) حضرت زُبیر کی شرکت اگر محض حالات کی جانکاری کے لئے تھی، اور انہوں نے میدانِ جنگ میں پہونچ کر جنگی مُہم میں بالکل حصہ نہیں لیا تو پھر مؤرخین کے اس بیان کی کیا توجیہ ہوگی؟ کہ اس جنگ میں شرکت کی وجہ سے نجاشی کی نگاہ میں حضرت زُبیر کی وقعت بڑھ گئی، اس لئے ایسا لگتا ہے کہ وہ خواہ جنگ کے لئے نہ گئے ہوں مگر میدانِ جنگ میں پہونچ کر کچھ ایسی حکمت عملی انہوں نے اختیار کی ہو جس کو نجاشی نے محسوس کیا ہو، اور اس کی وجہ سے حضرت زُبیر کی قدر اس کی نگاہ میں بڑھ گئی ہو۔ ورنہ محض تماشائی بن کر کھڑے رہنے کو نہ کوئی بادشاہ محسوس کر سکتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے کسی کی اہمیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

(ب) حالات کا علم حاصل کرنے کی جہاں تک بات ہے تو یہ بات صرف مسلمانوں کی حد تک معلوم تھی کہ اپنا ایک آدمی میدانِ جنگ میں جائے جو حالات کا صحیح علم حاصل کرے لیکن جو شخص میدانِ جنگ میں جائے گا اس کے بارے میں عام نگاہیں یہ نہیں سمجھیں گی کہ یہ محض خبر لینے کے لئے آیا ہے، بلکہ اس کو کسی جماعت کا جنگی نمائندہ تصوّر کیا جائے گا، اس لئے ممکن ہے کہ حضرت زُبیرؓ نے اپنے آپ کو میدانِ جنگ میں کچھ اس طرح پیش کیا ہو کہ نجاشی کو ان کی نمائندگی کا احساس ہوا ہو اور اس کو یقین ہوا ہو کہ مسلمان اس کے وفادار ہیں۔

آج کے حالات میں اس حکمت عملی کی بڑی اہمیت ہے۔

(ج) پھر شرکتِ جنگ کے لئے ضروری نہیں کہ عملاً قتال میں ہی حصہ لیا جائے، جنگ میں جو صَف بندی کی جاتی ہے جنگ کے دوران اس ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے، اس لئے کہ بسا اوقات پوری فوج جنگ میں استعمال نہیں ہو پاتی اور جنگ کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اس لئے عام اصطلاح میں جنگ میں شرکت، میدانِ جنگ کی شرکت ہے، نہ کہ عملاً قتال میں شرکت، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا:

من کثر سواد قوم فھو منھم ومن رضی عمل قوم کان شریک من عملہ بہ (مسند ابی یعلیٰ، نصب الرایہ: ۴/۳۴۶)

ترجمہ : جو شخص کسی قوم کی تعداد میں اضافہ کرے وہ انہیں میں سے ہے اور جو کسی قوم کے عمل سے راضی ہو وہ بھی گویا شریکِ عمل ہے۔

بالخصوص جنگوں میں عددی کثرت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ بھی ایک مستقل ہتھیار ہے دشمن کو مرعوب کرنے کا، غزوۂ بدر اس کی واضح مثال ہے۔

(د) پھر مسئلہ یہاں محض جنگ میں شرکت کا نہیں تھا، مسلمانوں کے ملی وجود و بقاء کا تھا، اور یہی وہ احساس تھا جس نے کچھ دیر کے لئے مسلمانوں کو بہت زیادہ پریشان کر دیا تھا، اسی فکر نے حضرت زُبیر کو ایک اسلامی نمائندہ کی حیثیت سے دریائے نیل عبور کرنے پر مجبور کیا تھا، اور اسی خطرہ نے مسلمانوں کو دعاء کے لئے سر بسجود کر دیا تھا، اور جس وقت مسلمانوں کے وجود و بقاء کا مسئلہ درپیش ہو اور بغیر جنگ میں شرکت کے یہ مسئلہ حل نہ ہو، تو فقہاء نے بھی اس کی اجازت دی ہے کہ کفر کی بالادستی کے باوجود مسلمان اپنی بقا اور تشخص کے لئے یا اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے اپنی فوجی خدمات پیش کر سکتے ہیں۔

شرح السیر میں مسلم قیدیوں کے بارے میں ایک جزئیہ ہے اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

و لو قال اهل الحرب لاسراء فيهم قاتلوا معنا عدونا من المشركين وهم لايخافون على انفسهم ان لم يفعلوا فليس ينبغي ان يقاتلوا معهم لان في هذا القتال اظهار الشرک والمقابل يخاطر بنفسه فلا رخصة في ذلک الا على قصد اعزاز الدين او الدفع عن نفسه فاذا كانوا يخافون اولئک المشركين الآخرين على انفسهم فلا باس بان يقاتلوهم لانهم يدفعون الآن شر القتل عن انفسهم ...... و لو قالوا للاسراء قاتلوا معنا عدونا من اهل حرب آخرين على ان نخلي سبيا كم اذاانقضت حربنا لو وقع في قلوبهم انهم صادقون فلا بأس بان يقاتلوا معهم يدفعون بهذا الامر عن انفسهم .

(شرح السیر الکبیر: ۲۴۱/۳، ۲۴۲، ۲۴۲-۲۴۳)

ترجمہ : اگر اہلِ حرب مسلم قیدیوں سے کہیں کہ ہمارے مشرک دشمنوں سے

ہمارے ساتھ ملکر جنگ کرو اور ان قیدیوں کو جنگ میں حصہ نہ لینے پر اپنے اوپر کوئی خطرہ نہ ہو تو ان کے لئے جنگ میں حصہ لینا درست نہیں، اس لئے کہ اس جنگ سے کفر ہی کو غلبہ حاصل ہوگا، اور جنگ کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس لئے اس قسم کی جنگ میں حصہ لینے کی اجازت اس وقت تک نہیں دی جاسکتی جب تک کہ دینِ اسلام کی عزت یا اپنے دفاع کا معاملہ درپیش نہ ہو۔ البتہ اگر ان قیدیوں کو دوسرے دشمن مشرکوں سے اپنے لئے خطرہ ہو تو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ یہ جنگ دراصل اپنی دفاع کے لئے ہوگی ......اور اگر اہلِ حرب یہ کہیں کہ ہمارے دشمنوں سے جنگ کرو جنگ ختم ہونے کے بعد تم کو رہائی دے دی جائے گی، اس صورت میں اگر ان مسلمانوں کو ان کے قول کی صداقت کا یقین ہو تو ان کے ساتھ اپنی دفاع کی امید پر جنگ میں حصہ لے سکتے ہیں۔

اس اصول کو مدِ نظر رکھا جائے تو جن علاقوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور خود اتنی عددی قوت نہیں رکھتے کہ انتخابی جنگ میں مستقل طور پر حصہ لے سکیں، لیکن کسی سیاسی جماعت کا ساتھ دینے سے بہت سے ملی اور قومی مفادات کے حصول کی امید ہو، اور بصورتِ دیگر قومی ترقی کی شاہراہ پر بچھڑ جانے کا اندیشہ ہو یا کسی سخت گیر اور متعصب ذہنیت رکھنے والی جماعت کے حاوی ہو جانے کا خطرہ ہو، نیز ووٹنگ سسٹم میں حصہ نہ لینے سے وفاداری مشکوک ہو سکتی ہو، ایسی صورت میں مسئلہ مسلمانوں کے لئے محض انتخاب میں شرکت کا نہیں رہ جاتا بلکہ ان کے وجود و بقا اور ملی تشخص کا ہو جاتا ہے۔

اگر اس روشنی میں حبشہ کے واقعہ کو بھی دیکھیں تو کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہ جاتی، اور نہ یہ کہنے کی ضرورت رہتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ واقعہ آیا یا نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ صحابہ کا اجتہاد (جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نکیر منقول نہ ہو) خود بھی ایک وزن رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس واقعہ کی سب سے معتبر راوی حضرت امِ سلمہ ہیں، جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئی ہوں گی تو حبشہ کے اس عظیم ترین واقعہ کو کیسے فراموش کر گئی ہوں گی، اس لئے اس سلسلے میں حضرت اُمِ سلمہؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کسی نکیر کا نقل نہ کرنا

حضور ﷺ کے سکوت کی دلیل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

فارس وروم کی جنگ کے موقع پر مسلمانوں کا ردعمل:

مکی دَور میں دونوں غیر مسلم تھے اور دونوں ایک عرصہ تک باہم برسر پیکار رہے فارس کی فتح پر مسلمانوں میں غم کا ماحول پیدا ہوا، اور روم کی آئندہ فتح کی خبر سن کران میں خوشی کی فضا پیدا ہوئی، یہاں تک کہ صدیق اکبر نے اس پر اُبی بن خَلف سے شرط بھی لگالی، خود حضور ﷺ نے اس تعلق سے صدیقِ اکبرؓ کوضروری مشورے دیئے، روم کی فتح کی خبر حضور کو مدینہ میں ملی تو آپ بے پناہ مسرور ہوئے، واقعہ کی پوری تفصیل تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔

(دیکھئے تفسیر مظھری: ۲۱۹/۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان)

علامہ ابن تیمیہ حضور ﷺ اور صحابہؓ کی مسرت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

و قد كان النبي ﷺ و اصحابه يفرحون بانتصار الروم والنصارىٰ على المجوس و كلاهما كافر لان احد الصنفين اقرب الى الاسلام .

(الحسبته فی الاسلام لابن تیمیه : ۱۳مطبوعه دارا الفکر لبنان)

ترجمہ: یعنی نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ مجوسیوں پر روم اور نصاریٰ کی فتح سے مسرور ہوئے حالاں کہ دُونوں فریق کافر تھے مگر اس لئے کہ ان میں سے ایک فریق اسلام کے قریب تھا۔

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غیر مسلموں کی دو متحارب جماعتوں میں سے نسبۃً کسی ایک بہتر جماعت کے ساتھ اخلاقی ہمدردی رکھنا اس کی فتح وشکست سے دلچسپی رکھنا، اور ممکن حد تک اس کی مدد کرنا جائز ہے، حضورؐ اور صحابہؓ مکہ جیسے دارالحرب میں تھے، عملاً اہلِ روم کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے، مگر حضور کے ذریعہ آئندہ فتح کی پیش گوئی یہ خود اہلِ روم کی بہت بڑی مدد تھی، کسی نبی کی آسمانی طاقت سے اس سے بڑی مدد کسی قوم کو کیا مل سکتی ہے کہ سات سال آئندہ آنے والی فتح کی خبر ابھی دے دی گئی، اگر اہلِ روم تک یہ خبر پہونچ سکتی تو یہ ان کا حوصلہ بڑھانے کے مترادف تھا، اس سے مشرکین مکہ میں کافی بے چینی پیدا ہوئی، حضور اور صحابہ مکہ میں جس

صورتِ حال سے دوچار تھے اس میں اس سے زیادہ کسی جماعت وقوم کی مدد نہیں کی جاسکتی تھی۔

غزوہ احزاب کا ایک واقعہ:

غزوہ احزاب کے موقعہ پر پورا عرب مسلمانوں کے خلاف ٹوٹ پڑا تھا، اور کفر اپنی پوری عددی طاقت کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوا تھا، یقیناً مسلمان اس وقت جس مشکل ترین صورتِ حال سے دوچار تھے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مختلف قسم کی جنگی حکمتِ عملی اختیار فرمائی اسی میں سے ایک کام یہ بھی تھا کہ آپ نے قریش کے اتحادی قبیلہ غطفان کو مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ دینے کی پیش کش فرمائی تا کہ وہ اتحاد سے الگ ہو جائے، آپ نے اس تجویز کے ساتھ اپنا ایک قاصد غطفان کے دوسردار عیینہ بن حصن، اور حارث بن ابی عوف المزنی کے پاس بھیجا، اور معاہدہ تقریباً طے ہوگیا، معاہدہ نامہ بھی تیار ہو گیا ......لیکن فیصلہ کے نفاذ سے قبل حضور ﷺ نے اوس وخزرج کے سردار حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ سے مشورہ کر لینا مناسب سمجھا، ان حضرات کو بلوایا اور ساری صورتِ حال سامنے رکھی ان حضرات نے عرض کیا اگر یہ آپ وحی کی روشنی میں کرنا چاہ رہے ہیں، تو سوائے سمع وطاعت کے چارہ نہیں اور اگر اپنی رائے سے کر رہے ہیں تو آپ کی رائے مقدم ہے، لیکن ہم نے اسلام سے قبل مجبور ہو کر آج تک ان کو کبھی مدینہ کی ایک کھجور بھی نہیں دی، ہاں خوشی سے یا بطورِ مہمانی کے وہ کھا سکتے تھے، آج جب اللہ نے ہمیں اسلام کی عزت سے مالا مال کیا اور آپ جیسی نعمت سے سرفراز کیا ہے، ہم ان کو اپنا مال کیوں دیں؟ سوائے تلوار کے ہم ان کو کچھ نہیں دیں گے یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دیں، حضور ان دونوں باعزیمت اصحاب کے عزم وہمت سے بہت مسرور ہوئے اور معاہدہ نامہ چاک کروادیا، (التلخیص الحبیر: ۳۸۱/۲، تاریخ طبری: ۱۴۷/۲، سیرت ابن ھشام: ۶۷۶، طبقات ابن سعد: ۵۲/۲،۵۳، امتاع الاسماع للمقریزی: ۲۳۵/۱، الوثائق السیاسیة: ۷۴)

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ مسلمان اگر نازک صورتِ حال سے دوچار ہوں، تو غیر مسلموں سے کسی چیز کے بدلہ ایسی مصالحت کی جاسکتی ہے، جس میں سخت گیر متعصب اور

دشمن جماعت کا زور ٹوٹ جائے بشرطیکہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی ہتک عزت لازم نہ آتی ہو، شرح السیر میں ہے۔

ففی هذا الحديث بيان ان عند الضعف لاباس بهذه الموادعة فقد رغب فيها رسول الله ﷺ حين احس بالمسلمين ضعفا و عند القوة لايجوز فانه لما قالت الانصار ماقالت علم رسول الله ﷺ منهم القوة فشق الصحيفة وفيه دليل ان فيها معنى الاستذلال ولاجله كرهت الانصار دفع بعض الثمار والاستدلال لايجوز ان يرض به المسلمون الا عند تحقق الضروره . (شرح السير :۶/۴، بحواله اعلاء السنن: ج۱۲ص۵۵)

ترجمہ : اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری کی صورت میں اس قسم کا معاہدہ کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے مسلمانوں میں کمزوری محسوس کرنے کے بعد ارادہ فرمایا، البتہ کمزوری نہ ہو تو جائز نہیں، یہی وجہ ہے کہ انصار کی گفتگو سننے کے بعد رسول اللہؐ کو مسلمانوں کی قوت کا اندازہ ہوا، اور آپ نے معاہدہ نامہ چاک فرمادیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کی صورت ذلت آمیز ہے اسی لئے انصار نے اس کو ناپسند کیا، اس سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ بلاضرورت مسلمانوں کے لئے اس قسم کا معاہدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

یعنی سخت ضرورت کی صورت میں جب کہ مسلمان بے حد ضعف میں مبتلا ہوں کفار کے سیاسی یا فوجی اتحاد کو کمزور کرنے کے لئے بعض سیاسی یا فوجی جماعتوں کو مالی یا اخلاقی تعاون پیش کرنے کی اجازت ہے۔

ووٹ اس دور میں سیاسی جماعتوں کے لئے سب سے بڑی دولت ہے کبھی اس کی قیمت لاکھوں اور کروڑوں میں لگتی ہے، اس لئے اگر مسلمان غیر مسلموں کی کسی ایک سیکولر جماعت کو اقتدار میں لاکر اس کے ذریعہ ملیّ مفادات حاصل کریں، یا کسی ایک جماعت کی حکومت بننے کے بجائے مختلف جماعتوں کی مخلوط حکومت بننے کے اسباب فراہم کریں تا کہ مسلمانوں کی عزت وآبرو، دولت وطاقت اور ملیّ اثاثے ان کے شرور وفتن سے محفوظ رہیں، تو

اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، بلکہ بعض حالات میں اس میں ثواب کی بھی امید ہے۔

سنتِ یوسفی:

نیز حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی غیر مسلم حکومت کی بلا دستی میں جس طرح قومی خدمات انجام دیں، اور اسی کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا بھی کام کرتے رہے یہ بھی ایک بہترین نظیر ہے کہ بعض مرتبہ مسلمانوں کے ضعت کی صورت میں غیر مسلم سیاسی جماعت کی بالا دستی میں رہ کر بھی اپنے حصے کا کام کیا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رقمطراز ہیں:

و کذلک یوسف الصدیق کان نائبا لفرعون مصر وھو وقومه مشرکون و فعل من العدل والخیر ما قدر علیه ودعاھم الی الایمان بحسب الامکان

(وظیفة الحکومة الاسلامیة لابن تیمیة صفحہ۱۳)

ترجمہ: یعنی حضرت یوسف علیہ السلام فرعونِ مصر کے نائب تھے، جبکہ فرعون اور اس کی قوم مشرک تھی، اور اس کی نیابت میں رہتے ہوئے حضرت یوسفؑ حتی المقدور عدل وخیر کے کام انجام دیتے اور ان کو ایمان کی دعوت بھی دیتے رہے۔

ان تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت ملّی اور قومی مفادات کے حصول کے لئے غیر مسلم سیاسی جماعتوں سے اتحاد قائم کرنا درست ہے، البتہ اس میں پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ مسلمان اپنا وزن اس اتحاد میں قائم کریں، اور ایک بالا دست قوت کی حیثیت سے ان کے درمیان کام کریں، اگر یہ صورت ممکن ہو تو ذلت کے ساتھ کفر کی بالا دستی تسلیم کرتے ہوئے اتحاد میں شامل ہونا جائز نہ ہوگا، البتہ اگر ایسی صورت ممکن نہ ہو تو اپنے دفاع اور تحفظ، ملّی مفادات کے حصول اور قومی ترقیاتی دوڑ میں شرکت کے لئے کفر کی بالا دستی کے باوجود ان کے اتحاد میں شامل ہونے یا اس کی تائید وحمایت کرنے کی اجازت ہوگی۔

اسی طرح اس کی بھی گنجائش ہے کہ معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا بنانے اور مثبت اقدار وروایات کی ترویج واشاعت کے لئے غیر مسلم جماعتوں کے اتحاد کے

ساتھ مل کر کام کیا جائے، بشرطیکہ اس میں کوئی بات خلافِ شرع نہ ہو، اور اسلام اور مسلمانوں کی ہتک عزت نہ لازم آتی ہو، جیسا کہ معاہدۂ حلف الفضول، معاہدۂ خزاعہ اور میثاق مدینہ سے ثابت ہوتا ہے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی تعلقات

جن علاقوں میں مسلمان غیر مسلم اقوام کے درمیان رہتے ہیں وہاں سماجی زندگی میں ایک دوسرے کی قربت کی وجہ سے مختلف مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

تہذیبی اختلاط اسلام کے مزاج کے خلاف ہے:

سب سے پہلا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سماجی قربت ایک دوسرے کی تہذیبی اور اخلاقی زندگی پر کس حد تک اثرانداز ہوتی ہے۔

مسلمانوں کو ہر ممکن حد تک غیر مسلموں کے طور طریق اور ان کے رسم و روایات سے دور رہنے کی تاکید کی گئی ہے، ان کی مشابہت اور نقل اتارنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، عبادات اور معاشرت کے تمام ممکنہ مسائل میں ایسی راہ منتخب کی گئی جس میں کسی قسم کے غیر اسلامی اثرات نہ پائے جائیں، اس موضوع پر متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ جن میں اسلامی معاشرہ کو غیر اسلامی تہذیب سے پاک رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، مثلاً

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من تشبه بقوم فهو منهم (رواہ احمد و ابو داؤد، مشکوٰۃ: ۳۷۵، کتاب اللباس)

ترجمہ: جو کسی قوم کی نقل اُتارے اس کا شمار اسی کے ساتھ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے میرے اوپر دو زعفرانی رنگ کے کپڑے دیکھے تو ارشاد فرمایا:

ان هذهٖ من ثياب الكفار فلا تلبسهما (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۳۷۴)

ترجمہ: یہ کفار کا لباس ہے اس کو مت پہنو۔

حضرت رُکانہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

فرق مابيننا و بين المشركين العمائم على القلانس. (ترمذی شریف

کتاب اللباس : ج ا ص ۳۰۸، حدیث غریب و قال الترمذی اسنادہ لیس بقائم،)

ترجمہ : ہمارے اور مشرکین کے عماموں میں فرق یہ ہے کہ ہمارا عمامہ ٹوپیوں پر ہوتا ہے ان کا نہیں۔

حضرت بریدہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو پیتل کی انگوٹھی پہنے دیکھا تو فرمایا میں تمہارے اندر بتوں کی بو محسوس کر رہا ہوں، اس نے وہ انگوٹھی پھینک دی اور پھر لوہے کی انگوٹھی پہن کر حاضر ہوا تو حضورؐ نے فرمایا میں تم پر اہلِ جہنم کا زیور دیکھ رہا ہوں، اس نے اس کو بھی پھینک دیا، اور دریافت کیا کہ کس چیز کی انگوٹھی بناؤں، آپ نے فرمایا چاندی کی اور اس کا وزن ایک مثقال سے کم رہے۔ (رواہ الترمذی و ابو داؤد والنسائی مشکوٰۃ :۳۷۸)

حضرت ابو ہریرۃؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان الیھود والنصاریٰ لایصبغون فخالفوھم متفق علیہ

(مشکوٰۃ باب الرجل :۳۸۰)

ترجمہ : یہود و نصاریٰ بالوں میں خضاب نہیں لگاتے تم ان کی مخالفت کرو۔

حضرت ابو ہریرۃ ہی کی روایت ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

غیروا الشیب ولا تشبھوا الیھود

(حدیث حسن صحیح ترمذی کتاب اللباس : جلد ۱/۳۰۵)

ترجمہ : سفیدی کو بدلو اور یہود کی نقل نہ اتارو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو اس کا حکم دیا، تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہود و نصاریٰ اس دن کا بہت احترام کرتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لئن بقیت الی قابل لاصمن التاسع (رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب صیام التطوع :۱۷۹)

ترجمہ : آئندہ سال اگر زندہ رہا تو نویں محرم کا بھی روزہ رکھوں گا۔

حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

اللحد لنا والشق لغیرنا۔(ترمذی ، ابواب الجنائز :ج۱/۲۰۲)

ترجمہ : لحد ہمارے لئے اور شق ہمارے غیروں کے لئے ہے،

حضرت ام سلمہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کے دن بطورِ خاص روزہ رہتے تھے اور فرماتے کہ:

انها یوما عید للمشرکین فاحب ان اخالفهم

(رواه ابو داؤد والنسائی و صحح، ابن حبان فتح الباری : ج ۴/۳۰۵)

ترجمہ : یہ دونوں دن مشرکوں کے عید کے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان کی مخالفت کروں۔

حضرت شداد بن اوس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خالفوا الیهود فانهم لایصلون فی نعالهم ولاخفافهم

(رواه ابو داؤد مشکوٰة باب السترة ۷۳)

ترجمہ : یہود کی مخالفت کرو وہ اپنے جوتوں اور خف میں نماز نہیں پڑھتے۔

حضرت علی روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک میں ایک عربی کمان تھی، آپ نے ایک شخص کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو آپ نے فرمایا اس کو پھینک دو اور اس طرح کی کمان لو، (رواه ابن ماجه ، مشکوٰة :۳۳۸/)

حضرت عائشہ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تقطعوا اللحم بالسکین فانه من صنع الاعاجم (رواه ابو داؤد و البیهقی فی شعب الایمان و قالا لیس هو بالقوی، مشکوٰة کتاب الاطعمة:۳۶۶)

ترجمہ : گوشت کو چھری سے نہ کاٹو اس لئے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے۔

حضرت ابوریحانہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کئی باتوں سے منع فرمایا ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ آدمی اپنے کپڑے کے نیچے ریشم لگائے اس لئے کہ یہ عجمیوں کا طرز ہے، یا یہ کہ اپنے مونڈھے پر ریشم لگائے اس لئے کہ یہ بھی عجمیوں کا طریقہ ہے۔

(رواہ ابو داؤد و النسائی ، مشکوٰۃ کتاب اللباس :۳۷۶)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ان کدتم لتفعلوا فعل الفارس یقومون علی ملوکھم و ھم قعود فلا تفعلو . (اعلاء السنن:۱۷/۴۲۳)

ترجمہ : قریب ہے کہ تم لوگ فارس وروم والوں کی طرح کرنے لگو وہ لوگ بھی اپنے بادشاہوں کے اردگرد کھڑے رہتے تھے۔اور وہ بیٹھے ہوتے" ایسا نہ کرو۔

حضور ﷺ کو اپنی امت کے تہذیبی اختلاط کا شدید اندیشہ تھا،ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا:

تتبعن سنن من قبلکم شبرا بشبر و ذراعا بذراع حتی لو دخلوا حجرضب تبعتموھم قیل یا رسول اللہ الیھود والنصاریٰ قال فمن متفق علیه

(مشکوٰۃ باب تغیر الناس:۴۵۸)

ترجمہ : تم اپنے سے پہلے والوں کی پوری طرح پیروی کروگے بالشت در بالشت ہاتھ در ہاتھ، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں داخل ہوں گے تو ان کی دیکھا دیکھی تم بھی اس بل میں گھس پڑوگے،لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ کی مراد پہلے والوں سے یہود ونصاریٰ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا پھر اور کون؟۔

کتبِ احادیث میں اس طرح کی بہت سی روایات موجود ہیں جن میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ تہذیبی اور تمدنی اختلاط سے منع کیا گیا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ ان میں کون سا حکم کس درجہ کا ہے؟ ان احادیث میں جو بنیادی روح ہے وہ ہے مسلمانوں کی تہذیبی اور سماجی تطہیر کا حکم۔

اس طرح کی روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان روئے زمین کے جس حصہ پر بھی آباد ہوں، اپنی تہذیب وثقافت، اسلامی اقدار وروایات اور اپنی پوری شناخت کے ساتھ آباد ہوں اور غالباً یہی وجہ تھی کہ یہود ونصاریٰ سے جزیرۃ العرب کے تخلیہ کا عمل خود عہدِ نبوی ہی میں شروع کر دیا گیا تھا، جس کی تکمیل حضرت فاروق اعظمؓ کے

ذریعہ عمل میں آئی۔ حضور ﷺ نے یہود کے سامنے جو خطاب فرمایا اس سے اس کی طرف صاف اشارہ ملتا ہے آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا:

یا معشر یہود اسلموا تسلموا اعلموا ان الارض للہ و لرسولہٖ و انی ارید ان اجلیکم من ھذہٖ الارض. (متفق علیہ : مشکوٰۃ :۳۵۵)

ترجمہ : اے جماعت یہود! مسلمان ہو جاؤ سلامتی پاؤ گے، جان لو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے اور میں تم کو اس سرزمین سے جلاوطن کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

لئن عشت ان شاء اللہ لاخرجن الیہود والنصاری من جزیرۃ العرب حتی لاادع فیھا الا مسلما (رواہ مسلم ، مشکوٰۃ : ۳۵۵)

ترجمہ : اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ میں یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے ضرور باہر کردوں گا، اور یہاں مسلمان کے سوا کسی کو رہنے نہ دوں گا۔

اگر چہ کہ یہ حکم جزیرۃ العرب کے لئے خاص ہے، اور ساری روئے زمین کو جزیرۃ العرب کا مقام نہیں مل سکتا، لیکن اس سے جو رجحان سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی منشاء یہ تھی کہ مسلمان روئے زمین پر ایک مکمل اسلامی زندگی گذاریں، جہاں غیر اسلامی قوم یا تہذیب کے اثرات موجود نہ ہوں،

اس موقع پر حضرت جریر بن عبد اللہؓ کی اس روایت سے بھی رہنمائی ملتی ہے جو ابوداؤد اور ترمذی میں آئی ہے۔

”حضور ﷺ نے ایک سریہ قبیلۂ خثعم کی طرف روانہ کیا تو کچھ لوگ اپنے ایمان کے اظہار اور قتل سے بچنے کے لئے سجدہ میں چلے گئے، لیکن مسلم فوجیوں نے اس کی رعایت نہیں کی، اور ان کو قتل کردیا، اس کی اطلاع حضور کو ملی تو آپ نے ان کی نصف دیت ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور ارشاد فرمایا:

انا بریئ من کل مسلم مقیم بین اظھر المشرکین قالوا یا رسول اللہ

لم قال لا تترای نارا هما (ابو دواؤد کتاب الجهاد باب النهی عن قتل من اعتصم بالسجود:۳۵۵، ترمذی باب ما جاء فی کراهیة المقابلین المشرکین:ج۱/۲۸۹)

ترجمہ: میں ہر ایسے مسلمان سے بَری ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہو، لوگوں نے عرض کیا، کیوں؟ آپ نے فرمایا اتنی دُور رہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکیں۔

ترمذی میں حضرت سمرہ بن جندب کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تساکنوا المشرکین ولا تجامعوھم فمن ساکنھم او جامعھم فھو مثلھم

(ترمذی :۱/۲۸۹)

ترجمہ: مشرکین کے درمیان نہ رہو اور نہ ان کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو جو ان کے درمیان رہے یا ان کے ساتھ اکٹھا ہو وہ انہیں کے مثل ہے۔

ان احادیث کا مصداق کیا ہے؟ ان کے مخاطب دار الحرب میں رہنے والے مسلمان ہیں یا وہ مسلمان جو غیر مسلموں کی مخلوط آبادی میں رہتے ہیں، یہ بحث اپنی جگہ پر ہے، لیکن علماء نے ان کی جو تشریحات اور توجیہات کی ہیں ہمارے مسئلہ سے ان کا خاص تعلق ہے۔

علامہ طیبی لکھتے ہیں کہ مسلمان کے لئے کافروں کے ساتھ سکونت اختیار کرنا درست نہیں اور حضور نے ایسے ہی مسلمانوں سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے، علماء نے اس کی کئی توجیہات کی ہیں، مثلاً

(۱) ابو عبید کا کہنا ہے کہ اس کا تعلق سفر سے ہے کہ اگر مسلمان کو دورانِ سفر قیام کی نوبت آئے تو مسلمانوں کی بستی میں کرے غیر مسلموں کی بستی میں نہیں، اس لئے کہ ان سے اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ وہاں جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔

(۲) ابو الہیثم کہتے ہیں کہ یہ ممانعت اس لئے ہے کہ غیر مسلموں کے تہذیبی اور فکری اثرات مسلمانوں کے اندر منتقل نہ ہوں، ''نار'' کا اطلاق سیرت و اخلاق اور عادات و اطوار پر بھی ہوتا ہے۔

(۳) توربشتی نے اس کو فرقہ وارانہ کشیدگی کا سبب بتایا ہے، غرض اس کی کئی توجیہات کی گئی ہیں، البتہ جو لوگ اس کے لئے مجبور ہوں، مثلاً مسلم قیدی وغیرہ تو ان کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے، (شرح الطیبی کتاب القصاص باب قتل اهل الرد: ۷/۱۱۰-۱۱۱، و کذا فی المرقات لعلی القاری: ج۴/۵۵)

علامہ ابن حزم تو اس باب میں مبالغہ کی حد تک متشدد ہیں ان کے نزدیک جو لوگ بلا عذر غیر مسلم ممالک میں مقیم ہیں ان کا ایمان ہی معتبر نہیں ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ نے ان سے اپنی براءت کا اعلان کیا ہے۔ (المحلی لابن حزم: ج۱۱/۲۰۰)

لیکن ان کا یہ تشدد درست نہیں، علامہ جصاص رازی نے ان کا جواب دیا ہے کہ یہ برأت مومن کی جان و مال سے ہے ان کے ایمان سے نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس میں شہید ہو جانے والے مسلمانوں کی طرف سے آپ نے نصف دیت ادا کرنے کا حکم فرمایا اور ان کو مسلم ''کا لقب عنایت کیا'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم ارشادی ہے، یعنی غیر مسلموں کے درمیان اقامت سے دین و ایمان میں نقصان نہیں آتا لیکن جان و مال کو خطرہ رہتا ہے۔

(احکام القرآن للجصاص الرازی: ج۲/۳۴۲)

مخلوط آبادی میں قیام کا حکم

رسول اکرم ﷺ کی یہ ہدایات وتعلیمات ثابت کرتی ہیں کہ مسلمانوں کی سماجی اور اخلاقی تطہیر، اور غیر اسلامی تہذیب وثقافت سے اسلامی معاشرہ کا تحفظ زیادہ مقدم اور ضروری ہے، اس لئے اگر مسلمانوں کو غیر اسلامی ممالک میں ایسی گنجائش میسر ہو کہ وہ اپنی خالص آبادیاں بنا سکیں تو اسلامی معاشرہ اور نسلوں کے تحفظ کے لئے اس کو اولین ترجیح حاصل ہونی چاہئے، البتہ اگر یہ ممکن نہ ہو تو حالتِ ضرورت میں جہاں سہولت ہو رہنے کی اجازت ہے۔

جہاں تک مخلوط آبادی میں رہ کر غیر مسلموں کو اپنے اسلامی اخلاق وکردار سے متأثر کرنے کی بات ہے تو عمومی طور پر اب ان اقدار وروایات کے حامل مسلمان نہیں رہے، جن کو دیکھ کر غیر مسلموں پر اسلام کے تعلق سے مثبت اثرات مرتب ہوں، اب تو شاعر مشرق کی زبان میں مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اس لئے ایسی سیرت واخلاق کے مسلمانوں سے اسلام کی علمی دعوت وتبلیغ کی امید نہیں ہے بلکہ ان حالات میں مزید ضروری ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کو علیحدہ آبادیوں میں منتقل کیا جائے تاکہ ان کی وجہ سے اسلام اور سلف صالحین کا نام بدنام نہ ہو۔

دوسرے اسلامی اخلاق وتہذیب سے غیر مسلموں کو متأثر کرنے کی اہمیت سب سے زیادہ عہدِ صحابہ میں ہو سکتی تھی، لیکن اس دَور میں بھی اس پر خاص توجہ دی گئی کہ مسلم معاشرہ غیر مسلم معاشرہ سے قطعاً مختلف رہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ شرعی اصول ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت سے مقدم ہے، مخلوط آبادی میں اسلامی اخلاق وکردار سے غیر مسلموں کے متأثر ہونے کی اگر کسی

درجہ میں امید ہے، تو اس سے کہیں زیادہ اسلامی معاشرے میں غیر اسلامی تہذیبی وفکری اثرات کے داخل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

نیز مخلوط آبادی میں ہندوستان جیسے ملکوں میں فسادات کے موقعہ پر مسلمانوں کا تحفظ ایک نازک مسئلہ بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ کشیدگی کی صورت میں بعض ان قومی رازوں کو چھپانا مشکل ہو جاتا ہے جن کی اس وقت بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

سب سے اہم ترین مسئلہ آج کے دَور میں انتخابات کے موقعہ پر مسلم نمائندگی کا سامنے آتا ہے، مخلوط آبادی میں کسی مسلم نمائندہ کا کامیاب ہونا بلکہ انتخاب کے لئے بحیثیت امیدوار کھڑا ہونا بھی مشکل ہوتا ہے اور اگر علیٰحدہ آبادیاں ہوں تو مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب بہتر ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا وجوہات کے پیشِ نظر میرے خیال میں مسلمانوں کی علحدہ آبادی کی صورت اگر ممکن ہو تو اس کو اولین ترجیح دی جانی چاہئے، بصورتِ دیگر مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی میں قیام کرنا ناجائز نہیں ہے، بلکہ ایسے مسلمان جن کی زندگیاں صحیح اسلامی نمونوں پر استوار ہوں، ایسے لوگوں کے لئے مخلوط آبادی میں قیام اسلام اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید ہوگا۔ اور انہی لوگوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کے اسلامی اخلاق وسیرت سے غیر مسلم متأثر ہوں گے اور اس سلسلے میں سب سے بڑا نمونہ صحابہ کرام کی زندگی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد اکثر صحابہ روئے زمین کے مختلف حصوں میں اسلام اور علوم اسلامیہ کی تبلیغ واشاعت کے لئے پھیل گئے، اور غیر مسلموں کے درمیان قیام پذیر ہوئے، اور اپنی دعوت وتبلیغ نیز اپنی اسلامی زندگیوں سے اسلام کے تعلق سے ان کے اندر مثبت تبدیلیاں پیدا کیں، صحابہ کے بعد اولیاء اللہ اور مشائخ بھی اس طریق پر گامزن رہے، اور یقیناً یہ اس معیار کے لوگوں کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے، لیکن عام مسلمانوں کے حق میں یہ مفید نہیں ہوگا۔

غیر مسلموں سے سماجی تعلقات کا معیار

جہاں تک غیر مسلموں سے سماجی تعلقات ، ایک دوسرے کی خوشی وغم میں شرکت اور مالی لین دین کے مسائل کا تعلق ہے، تو اسلام اس سے منع نہیں کرتا، اسلام ایک انسانیت دوست، انسانیت نواز اور امن پرست مذہب ہے، وہ مذہبی مسائل میں جبر کا قائل نہیں ہے، اور اسی لئے جو لوگ اسلام قبول نہیں کرتے نہ ان کا سماجی بائیکاٹ کرتا ہے نہ لوگوں کو ان سے عداوت و دشمنی پر بھڑکاتا ہے، نہ ان کی حق تلفی کی اجازت دیتا ہے، بلکہ وہ تمام انسانی اور شہری حقوق جو کسی انسان کو مل سکتے ہیں ان کو عطا کرتا ہے۔

بعض لوگوں کو قرآن پاک کی ان آیات سے غلط فہمی ہوتی ہے جن میں غیر مسلموں سے دوستانہ تعلق رکھنے سے روکا گیا ہے، مثلاً

لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المومنین و من یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شئی الا ان تتقوا منھم تقۃ. (آل عمران :۳۰)

ترجمہ : ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں، جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کچھ بھی تعلق نہ ہوگا، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔

یایھا الذین آمنوا لا تتخذوا آباء کم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان و من یتولھم فاولئک ھم الظالمون (توبہ:۳)

ترجمہ : اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو لوگ ان سے دوستی رکھیں گے تو وہی حد سے گذرنے والے ہوں گے۔

حالاں کہ اس قسم کی آیات کو ان کے نزول کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ حکم جنگ اور کشیدگی کے حالات کے لئے ہے، اور ان غیر مسلموں کے لئے ہے جو اسلام اور مسلمانوں

سے مختلف محاذوں پر مصروف پیکار ہیں، ان حالات میں تو ہر مذہب اور ہر قوم اپنے دشمن سے قطع تعلق کو ضروری قرار دیتی ہے، قرآن کریم کی بعض آیات میں ان حالات اور دشمن کے سازشی منصوبوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً

یا ایھا الذین لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانه منھم ان الله لایھدی القوم الظالمین فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم یقولون نخشی ان تصیبنا دائرة فعسی الله ان یاتی بالفتح او امر من عنده فیصبحوا علی مااسروا فی انفسھم ند مین (مائدہ:۸)

ترجمہ : اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے وہ انہی میں ہے، اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے، کہ وہ دوڑ کر ان سے جا ملتے ہیں کہتے ہیں ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے، تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں، (ترجمہ علامہ سید سلیمان ندویؒ)

یایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزوا و لعبا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و الکفار اولیاء واتقوا الله ان کنتم مؤمنین (مائدہ:۹)

ترجمہ : اے ایمان والو! اہلِ کتاب اور کفار میں سے ان کی جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ اور خدا سے ڈرو اگر یقین رکھتے ہو۔

ان آیات میں پوری وضاحت ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کار محرم اسرار، اور مددگار بنانے سے روکا گیا ہے، اور اس کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی باغیرت قوم یا فرد اپنا یا اپنے دین و مذہب کا استہزاء کرنے والے لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا کو گوارا نہیں کرسکتا۔ قرآن پاک میں اس طرح کی متعدد آیات موجود ہیں۔ جن میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اور حدود پر روشنی ڈالی گئی ہے، ایک آیت اس سلسلے میں بہت ہی

زیادہ واضح ہے۔

لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین و لم یخرجو کم من دیار کم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین ، انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلو کم فی الدین اخرجو کم من دیار کم و ظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم و من یتولھم فاولئک ھم الظالمون . (ممتنع:۲۰)

ترجمہ: خدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے ، اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں، خدا انصاف والوں کو پیار کرتا ہے، وہ صرف ایسے لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے سے منع کرتا ہے، جو تم سے تمہارے مذہب کے بارے میں جنگ کریں، اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار ہیں، جو ان سے دوستی کا دم بھر کریں گے وہی بے انصاف ہوں گے۔

قرآن نے یہ خبر بھی دے دی ہے کہ یہ حالات ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ بلکہ ایسے حالات بھی آنے والے ہیں جب یہ لوگ تمہارے بالکل دوست بن جائیں گے۔

عسی اللّٰہ ان یجعل بینکم و بین الذین عاد یتم منھم مودّۃ و اللّٰہ قدیر

(ممتحنہ:۳۰)

ترجمہ: اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے اور اللہ بڑی قدرت والا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن پاک کی یہ تمام آیات ان کے پورے تاریخی پسِ منظر کے ساتھ ہوں وہ کبھی اسلام کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔

اسلام ساری انسانیت کا دوست ہے اور ہر ایک سے اس کے حدود کے مطابق تعلقات رکھنے کی اجازت دیتا ہے، البتہ ہر تعلق میں یہ لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ اسلام اور مسلمانوں کی غیرت و وقار پر سوالیہ نشان نہ لگے۔ اور وہ اسلام کے مزاج یا اس کے بنیادی

اصولوں میں سے کسی اصول سے متصادم نہ ہو، اس تمہید کے بعد اس ذیل کے چند مسائل پر نظر ڈالتے ہیں، جو اس باب کے تحت بالعموم اٹھائے جاتے ہیں۔

غیر مسلموں کے تہواروں میں مسلم قصابوں کی خدمات:

غیر مسلم حضرات اپنے تہواروں کے موقع پر مسلمان قصاب سے جانور ذبح کرنے کی خواہش کرتے ہیں، اس صورت میں اگر یہ جانور بتوں کے سامنے ذبح نہ کئے جائیں، بلکہ بتوں سے دُور الگ مَقام پر ذبح کئے جائیں تو مسلمان قَصاب کے لئے گنجائش ہوگی کہ وہ غیر مسلموں سے تعلقات کی بنا پر ان کے جانور ذبح کر دے اور چاہے تو اس پر اُجرت بھی لے سکتا ہے عالمگیری میں ہے۔

اذا استاجر طبلا ليس بلهو و ذكر مدة يجوز و رجلا يحمل الجيفة اويذبح شاة او ظبيا يجوز (فتاویٰ عالمگیری کتاب الاجارۃ ر......)

ترجمہ : اگر کوئی غیر مسلم شخص کوئی طبلہ کرایہ پر لے جو آلۂ لہو ولعب نہ ہو، اور مدّت کا ذکر کر دے تو یہ معاملہ جائز ہے، یا کسی شخص سے کوئی مردار اٹھا کر لیجانے کا معاملہ کرے، یا بکری یا ہرن ذبح کرنے کا معاملہ کرے تو جائز ہے۔

اگر چہ کہ اس جزئیہ میں کسی مذہبی تہوار کا ذکر نہیں ہے لیکن بتوں کے سامنے ذبح نہ ہو اور بتوں کے نام پر نہ ہو تو اس کے عموم میں اس کی گنجائش نکلتی ہے، البتہ اگر بتوں کے سامنے ذبح کرنے کی فرمائش ہو تو میرے خیال میں اس کی گنجائش نہ ہوگی، اس لئے کہ یہ صریح طور پر **انما الخمر والميسر والانصاب** الآیۃ کے تحت داخل ہوگا، اور یہ بدترین معصیت ہے اور کسی معصیت میں تعاون جائز نہیں بالخصوص اس میں جو غیر مسلموں کے مذہبی شعائر میں داخل ہو۔

الانصاب کی تفسیر روح المعانی میں یہ کی گئی ہے۔

والانصاب وهى الاصنام المنصوبة للعبادة ويذبحون عندها والاصنام ماصور اوعبد من منع دون الله عزوجل (روح المعانی: ۱۵/۷)

ترجمہ : انصاب سے مراد بت ہیں، جو عبادت کے لئے نصب کئے گئے ہوں اور

مشرکین اس کے پاس جانور ذبح کرتے ہوں، اور بت سے مراد تراشا ہوا مجسمہ ہے یا اللہ کے سوا کوئی مخلوق جس کے ساتھ بت والا معاملہ کیا جائے۔

غیر مسلموں کی خوشی وغم میں شرکت:

باہم سماجی اور انسانی تعلقات کی بنیاد پر ایک دوسرے کی خوشی وغم میں شرکت کرنی پڑتی ہے، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ خلاف شرع کسی امر کا ارتکاب کرنا نہ پڑے، خود نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ غیر مسلم کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، بخاری و ابوداؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے۔

قال كان غلام يهودي يخدم رسول الله ﷺ فمرض فاتاه النبي ﷺ يعوده فقعد عند رأسه فقال له اسلم فنظر الى ابيه. وهو عنده . فقال له اطع ابا القاسم فاسلم فخرج النبي ﷺ وهو يقول الحمد لله الذي انقذه بي من النار .

(رواه احمد و البخاري وابو داؤد ، نيل الاوطار :ج۷/۲۷۹، اعلاء السنن :ج۱۲/۵۳۴)

ترجمہ: ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار ہوا تو رسول ﷺ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور اس کے سرہانے میں تشریف فرما ہوئے پھر آپ نے اس سے کہا مسلمان ہو جا! وہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا جو وہیں پر موجود تھا، اس کے باپ نے کہا ابوالقاسم کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا، حضور ﷺ اس کے پاس سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے میرے ذریعہ اس کو آگ سے نجات مرحمت فرمائی۔

بعض علماء نے اس حدیث کی شرح کے ذیل میں کہا ہے کہ اگر اسلام کی دعوت دینے کا ارادہ ہو اور امید ہو کہ وہ یہ دعوت قبول کرلے گا تو عیادت کر سکتے ہیں، یہ ارادہ یا امید نہ ہو تو عیادت جائز نہیں، ابن بطال وغیرہ کی یہی رائے ہے، لیکن حافظ منذری نے ان حضرات کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حدیث میں ایسی کوئی قید نہیں ہے بلکہ مختلف مقاصد اور مصالح

(جن میں سماجی اور انسانی تعلقات بھی شامل ہیں) کے تحت عیادت کرنے کا جواز ہے۔

(نیل الاوطار:۲۸/۷)

الاشباہ والنظائر میں ہے کہ اپنے غیر مسلم پڑوسی کی عیادت اور ضیافت مکروہ نہیں ہے۔ اس کے حاشیہ میں علامہ حموی رقمطراز ہیں کہ جامع الصغیر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسی کی قید محض اتفاقی ہے اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ وہ نصاریٰ کی عیادت کو جائز قرار دیتے تھے اسی طرح بہت سے فقہاء حنفیہ نے مجوسی کی عیادت کی اجازت دی ہے۔ بعض کو اس سے اختلاف بھی ہے۔(الاشباہ والنظائر احکام الذمی:۳۵۱)

امام ابویوسفؒ کی کتاب ''الخراج'' میں ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا کہ کسی یہودی یا نصرانی کا لڑکا یا کوئی رشتہ دار مر جائے تو اس کی تعزیت کن الفاظ میں کی جائے، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اس سے یہ الفاظ کہنے چاہئیں ''بیشک موت برحق ہے، اللہ آپ کو اس سے بہتر چیز عطا کرے، انا للہ وانا الیہ راجعون مصیبت پر صبر کیجئے۔

ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ ایک نصرانی شخص حضرت حسن بصری کے پاس آتا تھا، اور آپ کی مجلس میں بیٹھتا تھا اس کی موت ہوئی تو حضرت حسن اس کے گھر تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔(کتاب الخراج:۲۵۷)

غیر مسلم کی تجہیز و تکفین میں شرکت:

رہا یہ کہ غیر مسلم کے جنازہ یا اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنا کیسا ہے؟ تو اس سلسلے میں علماء کی عبارتوں سے حکمِ شرعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرنے والا غیر مسلم کسی مسلمان کا قریبی رشتہ دار ہو، اور اس سے زیادہ کوئی قریب ترین اہلِ تعلق موجود نہ ہو جو اس کی تجہیز و تکفین کی ذمّہ داری اٹھا سکے، تو ایسے شخص کے لئے اپنے غیر مسلم رشتہ دار کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنا اور اس ذمّہ داری کو نبھانا جائز ہے، اور اس حکم کا اصل ماخذ حضرت ابوطالب کا واقعۂ انتقال ہے۔

حضرت ابوطالب کا انتقال ہوا اور حضرت علیؓ نے رسول اکرم ﷺ کو چچا کی موت کی خبر دی تو آپ نے حضرت علیؓ کو ان کی تجہیز و تکفین کا حکم دیا، اس لئے کہ حضرت علیؓ بحیثیت بیٹا ان

سے زیادہ قریب تھے، یہ روایت مختلف طرق سے مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ (نصب الرایہ : ج۲ ص۲۸۱، اعلاء السنن: ج۸/ص۲۸۲ بروایت ابو داؤد، نسائی، طبرانی، مسند احمد ابویعلیٰ، بزار اور بیہقی، التلخیص الحبیر لابن حجر: ج۱/ص۱۵۷، ۱۵۸)

ایک روایت دارقطنی میں حضرت کعب بن مالک کے حوالے سے آئی ہے، فرماتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور اپنی نصرانی ماں کی موت کی خبر سنائی اور عرض کیا کہ میں اس کے جنازہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں، تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ارکب دابتک وسرا مامها فانک اذا کنت امامها لم تکن معها

کہ اپنی سواری پر سوار ہو کر جنازہ سے آگے آگے چلو، آگے چلنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس جنازہ کے ساتھ نہیں ہو، (جبکہ لوگ تم کو ساتھ سمجھ رہے ہوں گے) یعنی اس حکمتِ عملی سے صورۃً تمہاری شرکت ہو جائے گی اور حقیقت میں نہیں ہوگی۔)

امام احمد کا نقطۂ نظر اسی حدیث کے مطابق ہے کہ غیر مسلم رشتہ دار کی موت میں شرکت جائز نہیں لیکن علامہ زیلعی نے اس حدیث کو ضعیف اور نا قابلِ استدلال قرار دیا ہے۔ (نصب الرایہ: ۲/۲۸۱)

فقہاء حنیفہ اور اکثر علماء نے حضرت ابو طالب کی تجہیز و تکفین والی روایت کو اس باب میں ماخذ قرار دیا ہے اور اس حدیث کے مطابق یہ حکم بیان کیا ہے کہ قریب ترین رشتہ داروں کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی جا سکتی ہے البتہ اگر کوئی دوسرا قریبی متبادل شخص موجود ہو تو شرکت سے احتیاط کرنا اولیٰ ہے، مگر ظاہر ہے کہ بعض مرتبہ مختلف مصالح کے تحت احتیاط پر عمل نہ کرنا خود احتیاط بن جاتا ہے، درمختار میں ہے۔

ویغسل المسلم ویکفن ویدفن قریبه الکافر الاصلی عند الاحتیاج فلوله قریب فاولیٰ ترکه لهم (در مختار علی هامش رد المحتار صلوٰۃ الجنازہ: ج۳ ص/۱۳۴، کذا فی البحر الرائق: ج۲/ص۳۲۵، و کذا فی الهندیه کتاب الجنائز: ج۱ص/۱۶۰/ وغیره ذلک من الکتب الفقهیة)

ترجمہ : مسلمان اپنے قریب ترین کافر رشتہ دار کی تجہیز وتکفین اور تدفین وغیرہ میں بوقتِ ضرورت شریک ہوسکتا ہے البتہ اگر کوئی اور رشتہ دار ہو تو چھوڑ دینا بہتر ہے۔

(واضح رہے کہ فقہاء نے یہ مسئلہ دار الاسلام کے پس منظر میں لکھا ہے غیر مسلم ملکوں کے لئے یہ بات اتنی آسانی سے نہیں لکھی جا سکتی تھی)

اور اگر کوئی غیر مسلم مر جائے اور اس کا کوئی رشتہ دار موجود نہ ہو نہ مسلمانوں میں اور نہ غیر مسلموں میں اور کوئی غیر مسلم اس ذمّہ داری کو اٹھانے کے لئے موجود یا تیار نہ ہو، تو ایسی صورت میں مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی تجہیز وتکفین کریں اور اس حکم کا ماخذ بَدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے حضور ﷺ نے بَدر کے تمام غیر مسلم مقتولین کو خود اپنی نگرانی میں دفن کروایا اس لئے کہ کفارِ مکہ شکشت کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

(روض الانف بحوالہ سیرۃ النبی علامہ شبلی نعمانی :ج۱ص/۳۱۹)

عہدِ حاضر کے علماء میں شیخ عبدالعزیز بن بازؒ نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔

(فتاوی اسلامیہ :ج۲/ص۲۰ بیروت)

البتہ وہ غیر مسلم جن سے محض سماجی یا انسانی تعلق ہو اور ان کی تجہیز وتکفین کرنے والے دوسرے لوگ موجود نہیں ایسے لوگوں کی تجہیز وتکفین میں شرکت کے لئے عبداللہ بن اُبی کے جنازہ میں رسول اکرم ﷺ کی شرکت کو ماخذ بنایا جا سکتا تھا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (عبداللہ بن عبداللہ کی خواہش پر) عبداللہ بن ابی کی قبر کے پاس تشریف لائے جبکہ اس کو قبر کے گڑھے میں رکھا جا چکا تھا اس کو نکالنے کا حکم دیا اور اس کا سر اپنے گھٹنے پر رکھ کر اپنا لعاب مبارک اس کے کفن پر ڈالا اور اپنی قمیص اس کو پہنائی، اور پھر اس کو دفن کیا گیا۔ (متفق علیہ ، مشکوٰۃ ، کتاب الجنائز : ۱۴۴)

ایسا آپ نے کیوں فرمایا حضرت جابر بن عبداللہ کا خیال ہے کہ اُحد کے موقع پر حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس کو کپڑا عبداللہ بن اُبی نے دیا تھا یہ اسی کا بدلہ تھا۔

(متفق علیہ ، مشکوٰۃ :۱۴۴)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ عمل ایک دینی مصلحت کے تحت فرمایا، حضرت عمرؓ نے جب آپ سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا میرا کفن یا لعاب اس کو نفع تو نہیں دے گا لیکن میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ میرا حسن سلوک شاید اسکی قوم کے اسلام لانے کا سبب بن جائے۔

چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر قبیلہ خزرج کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہوئے۔ (تفسیر کبیر امام رازی: ج۸/ص۱۲۱، احکام القرآن لابن العربی: ج۲/ص۹۹۲، جامع البیان للطبری: ج۱/ص۱۴۲، تفسیر مظهری: ج۴/ص۲۷۷ سورۂ توبہ)

لیکن ان تمام مصالح کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے اس عمل کو باقی رہنے نہ دیا اور آیت کریمہ نازل فرما کر آپ کو کسی بھی مشرک کی قبر پر جانے یا اس کے جنازہ میں شرکت سے منع فرمادیا۔

ولا تصل علی احد منهم مات ابدا ولا تقم علی قبره (التوبة:۸۴)

ترجمہ: کسی غیر مسلم پر آپ کبھی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں۔

صاحب جلالین لکھتے ہیں:

ولا تقم علی قبره لدفن او زیارة . (جلالین: ج۱/ص۱۶۴)

ترجمہ: آپ ان کی قبر پر کھڑے نہ ہوں نہ دفن کی غرض سے اور نہ زیارت کے لئے،

علامہ جصاص رازی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

قال علماؤنا هذا نص فی الامتناع من الصلوٰة علی الکفار

(الجامع لاحکام القرآن: ج۸/ص۱۴۰/ دار الکتب العلمیة)

ترجمہ: ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ کفار پر نمازِ جنازہ پڑھنے سے ممانعت کر دی گئی ہے۔ (تو پھر ان کے لئے ایصال ثواب کا کیا جواز بنتا ہے)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلا ضرورت غیر مسلم کے جلوسِ جنازہ یا اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی اجازت نہیں ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ تمام رسوم و اعمال غیر اسلامی طریقے

پر انجام دیئے جائیں، اور بہت سی منکرات بھی اس میں موجود ہوں، اس لئے عام حالات میں عام مسلمانوں کے لئے بلاضرورت اس کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

غیر مسلموں سے تحائف کا تبادلہ:

غیر مسلموں سے جائز مقاصد کے تحت عام حالات میں ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ جائز ہے، البتہ مخصوص حالات میں اس سے احتیاط کی جائے تو بہتر ہے، رسول اکرم ﷺ سے اس سلسلے میں دونوں طرح کا عمل منقول ہے، آپ نے کئی غیر مسلموں کا ہدیہ قبول فرمایا ہے، اور بعض کو خود بھی ہدیہ دیا ہے، جبکہ کئی غیر مسلموں کا ہدیہ آپ نے رد فرمادیا ہے۔

مثلاً ۵ھ میں جب اہلِ مکہ مسلمانوں پر حملہ کے لئے اپنی فوجی مہم نہ بھیج سکے، تو رسول ﷺ نے ان کی دلجوئی کے لئے حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری کے ہمراہ ابوسفیان کو عجوہ کھجوریں بطورِ ہدیہ ارسال فرمائیں، اور ایک مکتوب کے ذریعہ خود ان سے بھی کچھ ہدیہ طلب فرمایا، چنانچہ حضرت ابوسفیان نے آپ کو وہ چیز بطورِ ہدیہ ارسال کی۔

(کتاب الاموال لابی عبید فصل نمبر ۶۳۱، شرح السیر الکبیر للسرخسی باب۱۳ج۱ رص۷۰، مبسوط سرخسی: ج۱۰رص۹۲، الوثائق ۷۶ر ۷)

قبطی رئیس مقوقس نے حضور ﷺ کو دو اچھی باندیاں، اور ایک خچر بطورِ ہدیہ بھیجا، اور اس کا ذکر اس نے اپنے مکتوب میں بھی کیا جو نبی ﷺ کے نام اس نے تحریر کیا تھا، حضور ﷺ سے اس کی تردید منقول نہیں ہے۔

(فتوح مصر لابن عبد الحکم ۴۸ر، قسطلانی: ج۲رص۲۹۲-۲۹۳، قلقشندی: ج۶ر ص۴۶۷، الزیلعی: ج۱رص۲، الوفاء لابن الجوزی ۱۷ر۷، الزرقانی: ج۲رص۳۴۹ر الوثائق السیاسیة: ۱۳۶)

بحرین میں کسریٰ کے گورنر اُسَیبُخت بن عبداللہ نے غالباً حضور کو لکھا تھا کہ آپ کسی چیز کی فرمائش کریں تو ارسال کروں گا، اس کے جواب میں رسول اکرم ﷺ نے تحریر فرمایا:

اما بعد فانی لااستھدی احداً فان تھدالی اقبل ھدیتک،

ترجمہ : میں کسی سے ہدیہ طلب نہیں کرتا اگر تم کوئی ہدیہ بھیجو گے تو قبول کرلوں گا۔

(طبقات ابن سعد ج ۱،ص ۲۷، معجم البلدان لیاقوت مادة " البحرین " الوثائق السیاسیة ۱۵۳-۱۵۴)

بعض ہدیے آپ نے رد بھی فرمائے ہیں مثلاً ابو براء عامر بن مالک بن جعفر ملاعب الاسنة نے حضور ﷺ کی خدمت میں ایک گھوڑا بطورِ ہدیہ بھیجا آپ نے اس کا گھوڑا یہ کہہ کر واپس فرمادیا کہ

انی نهیت عن زبد المشرکین..... مجھے مشرکین کے ہدیہ سے روکا گیا ہے۔

(روض الانف ج۲،ص ۳۲۱، کتاب الاموال لابی عبید ص ۶۳۰،الوثائق السیاسیة ص ۳۱۴)

بعض تحفے آپ نے واپس تو نہیں کئے لیکن خود بھی استعمال نہیں کئے بلکہ لوگوں میں تقسیم کرادیئے مثلاً ہرقل نے حضور ﷺ کی خدمت میں کچھ دینار بطور ہدیہ بھیجے تھے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا تھا، جبکہ حضور ﷺ تبوک میں قیام فرما تھے، حضور ﷺ نے اس کو جھوٹا قرار دیا اور اس کے بھیجے ہوئے دینار لوگوں میں تقسیم کرادیئے۔ (تاریخ دمشق لابن عساکر :۴۲۰، مسند احمد بن حنبل :ج ۳ /ص ۴۴۱، ۴۴۲، ج ۴ /۷۴-۷۵، کتاب الاموال لابی عبید فصل ۶۲۴/، ۶۲۵،الوثائق السیاسیة: ۱۱۴-۱۱۵)

حضور ﷺ سے منقول ان روایات کے درمیان علماء نے دوطرح سے تطبیق دی ہے۔

(۱) ایک یہ کہ جس شخص کے بارے میں آپ کو احساس ہوا کہ اس کے گمان میں آپ کی تمام تر جنگی جدوجہد کا مقصد مال و دولت کا حصول ہے، اس کے ہدیہ کو آپ نے رد فرمادیا، اور جس کے بارے میں خلوص کا یقین ہوا اس کو قبول فرمالیا۔

(۲) دوسری تطبیق یہ دی گئی ہے کہ جس غیر مسلم کا ہدیہ قبول کرنے میں دینی اور ملی صلابت وغیرت کی کمی کا احساس ہوتا اس کو رد فرمادیتے اور جہاں یہ احساس نہ ہوتا اس کو قبول فرما لیتے۔ (المحیط:ج ۶ /ص ۲۳۲ ،بحواله امداد الفتاویٰ:ج ۳،ص ۴۸۱-۴۸۲)

فقہاء نے انہی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ

ولا یقبل هدیة الکفار ان کان یقل صلابته معهم بقبولها

(فتاویٰ هندیه کتاب الکراهیة:ج٦رص٣٥٩)

ترجمہ: اگر غیر مسلموں کا ہدیہ قبول کرنے میں غیرت ایمانی اور کفر کے بالمقابل صلابت میں کمی آنے کا اندیشہ ہوتو ان کا ہدیہ قبول نہ کرے۔

اسی طرح یہ مسئلہ بھی اسی سے مستنبط کیا گیا ہے کہ اگر غیر مسلم کا ہدیہ قبول کرنے کا مقصد ان کی دلجوئی اور پھر اس کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں سے قربت کی امید ہوتو ہدیہ قبول کرنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔ (شرح السیر الکبیر ج٣رص٧٢، فتح الباری لابن حجر :ج٥رص ١٧١، اعلاء السنن :ج٦رص١٥٢)

یہ حکم عام حالات کے لئے ہے، یعنی غیر مسلموں کے ایسے تحفے جو ان کے مذہبی تہواروں سے متعلق نہ ہوں ان کا قبول کرنا مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق جائز ہے۔

غیر مسلموں کی دعوت:

اسی طرح غیر مسلموں کی دعوت کرنا یا ان کی دعوت قبول کرنے کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر شرح صدر ہو، اپنی صلابت ایمانی کے کمزور ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اور اس کی عادت نہ بنالی جائے، تو غیر مسلموں کی دعوت قبول بھی کی جاسکتی ہے، اور ان کی ضیافت بھی کی جاسکتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے موقعہ پر ایک یہودیہ عورت کی دعوت قبول کی اور اس کا بھیجا ہوا گوشت تناول فرمایا، یہ بھی دریافت نہیں فرمایا کہ یہ کس کا ذبیحہ ہے۔

(احکام القرآن للجصاص :ج٢رص٣٩٤)

فتاویٰ ہندیہ میں ہے۔

و اکل مع الکفار او ابتلیٰ به المسلم لاباس لومرة او مرتین و اما الدوام علیه فیکره.

(فتاویٰ هندیه کتاب الکراهیة:ج٥رص٣٥٩)

ترجمہ: مسلمانوں کو اگر غیر مسلموں کے ساتھ کھانے کی نوبت آجائے تو ایک دوبار میں کچھ حرج نہیں، البتہ عادت بنالینا مکروہ ہے۔

اس طرح گاہے گاہے عام حالات میں غیر مسلم کو دعوت بھی دی جاسکتی ہے، ہندیہ میں ہے،

لا باس بان یضیف کافرا لقرابة اولحاجة کذا فی القرتاشی

(هندیه کتاب الکراهیة: ج۵/ص۳۴۷)

ترجمہ: قرابت یا حاجت کی بنیاد پر کسی غیر مسلم کی ضیافت کرنا جائز ہے۔

یہ تمام گفتگو عام حالات کے لئے ہے۔

غیر مسلموں کے تہواروں کا تحفہ:

البتہ مذہبی تہوار میں مثلاً دیوالی یا ہولی یا کرسمس وغیرہ کے موقع پر جو تحفے یا دعوتیں دی جاتی ہیں ان میں تھوڑی سی تفصیل ہے۔

صحابہ اور سَلفِ صالحین سے اس سلسلے میں دو قسم کے رجحانات منقول ہیں، مثلاً

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے منقول ہے کہ کسی غیر مسلم نے ان کی خدمت میں نیروز کا ہدیہ پیش کیا تو آپ نے قبول کرلیا۔ (الاقتضاء لابن تیمیه :۱۲۰)

مصنف بن ابی شیبۃ میں روایت ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا کہ مجوسیوں سے ہمارے تعلقات ہیں اور اس کی وجہ سے وہ اپنے تہوار کے موقعہ پر ہمیں ہدیہ دیتے ہیں، حضرت عائشہ نے فرمایا اس دن جو ذبیحے ہوتے ہیں ان میں سے اگر گوشت وغیرہ دیں تو نہ کھاؤ، البتہ پھل وغیرہ کھاسکتی ہو۔ (حوالۂ بالا)

حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے منقول ہے کہ مجوسیوں سے ان کے بعض روابط تھے، ان کے پڑوس میں وہ لوگ آباد تھے نیروز اور مہرحان کے موقعہ پر وہ لوگ تحفے وغیرہ بھیجا کرتے تھے تو وہ اپنے گھر والوں سے فرماتے کہ پھل وغیرہ تو کھالو اور باقی چیزیں واپس کردو۔

ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ:

ان آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایا اور تحائف کے باب میں تہوار سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اور نہ اس سے غیر مسلموں کی اعانت لازم آتی ہے، اس لئے غیر حربی کافروں کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، خواہ وہ تہوار کے موقعہ پر ہو یا کسی اور موقع پر۔

(اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیه : ۱۲۰)

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بھی یہی رائے ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''صرف دو جزو خاص قابل تعرض کے باقی رہ گئے، ایک یہ کہ ہدیہ دیوالی کا شاید اس تہوار کی تعظیم کے لئے ہو جس کو فقہاء نے سخت ممنوع لکھا ہے، دوسرا یہ کہ اس میں تصاویر بھی ہوتی ہیں، ان کان اقتناء واحترام مستلزم للتقوم والشمال لازم آتا ہے اور بعض فروع میں تصاویر کے تقوم کی نفی کی گئی ہے، تو اس میں اس حکم شرعی کا بھی معارضہ ہے، جواب اول کا یہ ہے کہ یہ عادت سے معلوم ہے کہ اس ہدیہ کا سبب مہدی لہ کی تعظیم ہے نہ کہ تہوار کی تعظیم، اور جواب ثانی کا یہ ہے کہ مقصود اہداء میں صورت نہیں بلکہ مادہ ہے، البتہ یہ واجب ہے کہ مہدی لہ فوراً تصاویر کو توڑ ڈالے۔ (امداد الفتاویٰ: ج ۳/ص ۴۸۲)

اس کے بالمقابل حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ذخیرۃ الفتاویٰ کی ایک عبارت نقل کی ہے، اس سے تہوار کے موقعہ پر غیر مسلموں کے تحائف قبول کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، ذخیرہ کی عبارت ہے:

لا ینبغی للمومن ان یقبل هدیة کافر فی یوم عید و لو قبل لا یعطیهم ولا یرسل الیهم (فتاویٰ عبد الحی اردو: ج ۱/ص ۴۰۳)

ترجمہ: مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ کافر کا ہدیہ تہوار کے موقع پر قبول کرے، اور اگر قبول کرے تو ان کو ہرگز کوئی تحفہ بدلہ میں نہ دے اور نہ کسی کے ہاتھ بھیجے۔

فی یوم عید کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں کے تہوار پر ہوسکتا ہے۔

تھوڑی گنجائش تو ذخیرہ کی عبارت میں بھی موجود ہے۔ دونوں رجحانات کے درمیان تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے، کہ مذہبی تہواروں کے موقع پر دو طرح کے تحفے آتے ہیں، بعض وہ ہوتے ہیں جو بتوں اور دیوتاؤں پر چڑھائے جاتے ہیں، جن کو برادران وطن ''پرشاد'' کہتے ہیں، ان کا قبول کرنا جائز نہیں ہونا چاہیئے، اس لئے کہ **مااهل به لغیر الله** کا اطلاق اس پر بھی

ہوتا ہے، اور ذخیرہ کی عبارت کا محمل غالباً یہی صورت ہے، اور بعض وہ ہوتے ہیں جو اس موقعہ پر لوگوں میں تقسیم کرنے یا بچوں کے کھانے کے لئے بنائے جاتے ہیں، اس قسم کے تحفے قبول کرنے کی گنجائش ہے اور علامہ ابن تیمیہؒ اور حضرت تھانویؒ کے فتاویٰ کا محمل غالباً یہی شکل ہے۔

اس طرح سابقہ تفصیلات سے حکم شرعی یہ منقح ہو کر سامنے آتا ہے کہ غیر مسلموں کے غیر مذہبی تحائف قبول کرنا شرح صدر اور حالات کے مطابق جائز ہے، اور اگر حالات اجازت نہ دیں یا غیر مسلم کی نیت و عمل پر اطمینان نہ ہو تو قبول کرنا مناسب نہیں، اور مذہبی تحائف اگر بتوں پر چڑھائے ہوئے ہوں تو قبول کرنا جائز نہیں اور اگر بتوں پر چڑھائے ہوئے نہ ہوں تو قبول کرنا جائز ہے۔

غیر مسلموں کو ان کے تہواروں میں تحفے دینا:

ذخیرۃ الفتاویٰ کے مذکورہ بالا جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے مذہبی تہواروں کے موقعہ پر ہدیہ دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، نہ ہدیہ کے بدلے میں ہدیہ دینا درست ہے اور نہ اپنی طرف سے اس میں پہل کرنا درست ہے، علامہ ابن تیمیہ نے "**اقتضاء الصراط المستقیم**" میں جو بحث کی ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ:

"ابن القاسم نے نصرانی کو اس کے تہوار کے موقعہ پر ہدیہ بھیجنے کو مکروہ کہا ہے، چاہے بدلہ کے طور پر ہی ہو، بلا بدلہ دینا تو اور بھی زیادہ مکروہ ہے، اس لئے کہ اس میں ان کے تہوار کی تعظیم اور مصالح کفر میں ان کی یک گونہ مدد ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں کے موقعہ پر ان کے لئے ان کے تہوار کی مناسبت سے کوئی چیز بنا کر مثلاً گوشت، سالن وغیرہ بیچنا یا اپنی سواری ان کو بطورِ عاریت دینا وغیرہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں ان کے کفر و شرک کی تعظیم اور مصالح کفر کا تعاون ہوتا ہے، مسلم بادشاہوں کو چاہئے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کی اس قسم کی شرکت پر پابندی لگائیں، امام مالک اور دیگر علماء کی رائے یہی ہے اور میرے علم میں اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(اقتضاء الصراط المستقیم:۱۱۱)

غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں شرکت:

اسی سے اس کا حکم بھی نکلتا ہے کہ غیر مسلموں کے مذہبی میلوں اور تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت یا ان کے عبادت خانوں میں مسلمانوں کا جانا تفریح یا نمائندگی کی نیت سے جائز نہیں ہے، البتہ تجارت کی نیت سے جانا جبکہ وہاں معصیت نہ ہو اور عذر وغیرہ میں داخل ہونے کی نوبت نہ آئے تو اس کی گنجائش ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے جامع خلال کے حوالہ سے لکھا ہے:

کہ امام احمد سے شام میں غیر مسلموں کے بعض مذہبی تہوار مثلاً طور یا بور، اور دیر ابواب وغیرہ میں مسلمانوں کی شرکت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ مسلمان وہاں خریداری وغیرہ کے لئے جائیں تو کیا حکم ہے؟ تو امام احمدؒ نے جواب دیا کہ صرف خریداری مقصد ہو ان کے عبادت گھروں میں داخل نہ ہوں تو حرج نہیں، امام احمد نے حضرت عمرؓ کے حوالہ سے بیان فرمایا کہ وہ تہوار کے موقعہ پر غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں جانے سے منع فرماتے تھے۔

(اقتضاء الصراط المستقیم: ص ۱۳۰، اعلاء السنن: ج ۱۲/ ص ۷۰۶)

ابن القاسم سے سوال کیا گیا کہ جو کشتیاں غیر مسلموں کے مذہبی میلوں کی طرف جا رہی ہوں ان میں سوار ہونا کیسا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ مکروہ ہے اس لئے کہ ان کے ساتھ اجتماع پر اللہ کے غضب کا اندیشہ ہے۔ (الاقتضاء: ص ۱۱۱)

حضرت عمرو بن مرۃ "لا یشھدون الزور" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

لا یمالئون اھل الشرک علی شرکھم ولا یخالطونھم

(رواہ ابو الشیخ و سکت عنہ ابن تیمیۃ، الاقتضاء: ص ۸۱)

ترجمہ: یعنی اہلِ شرک کے شرکیہ افعال کی طرف متوجہ نہ ہو اور نہ ان کے ساتھ کسی مقام پر جمع ہو۔

حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

ایاکم وان تدخلوا علی المشرکین یوم عیدھم فی کنائسھم (رواہ الشیخ ،الاقتضاء:ص۸۶)

وروی البیھقی باسناد صحیح عن سفیان الثوری عن ثور بن یزید عن عطاء بن دینار نحوہ (اعلاء السنن:ج۱۲رص۷۰۲-۷۰۳)

ترجمہ: مشرکین کے تہواروں میں ان کے عبادت خانوں میں داخل ہونے سے بچو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں:

من بنیٰ ببلاد الاعاجم وصنع بنیروز ھم ومھر جانھم و تشبہ بھم حتی یموت وھو کذلک حشر معھم یوم القیٰمۃ ولہ طرق عدیدۃ صحاح و حسان ذکرھا ابن تیمیہؒ (الاقتضاء:ص۹۵)

ترجمہ: جو غیر مسلموں کے علاقے میں گھر بنائے اوران کے تہواروں کی نقل اتارے،ان میں شریک ہواوراسی حالت میں مرجائے ،تو قیامت کے دن اس کا حشر انہی کے ساتھ کیا جائے گا۔

ان آثار واقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے مذہبی میلوں میں ان کی رعایت ودلجوئی کی خاطر شرکت جائز نہیں ہے۔

اس سلسلے میں بعض عمومی احادیث سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے،جن میں معصیت کی محفلوں میں شرکت کو باعثِ گناہ قرار دیا گیا ہے،مثلاً

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود کو ایک ولیمہ کی دعوت ملی اور وہ تشریف لے گئے،لیکن وہاں خرافات دیکھ کر واپس لوٹ گئے ،لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

من کثر سواد قوم فھو منھم ومن رضی عمل قوم کان شریک من عمل بہ (رواہ ابو یعلی فی مسندہ، نصب الرایہ:ج۴رص۳۴۶، کنز العمال :ج۹رص۲۲،رقم۔ ۲۴۷۳۵، جامع المسانید والسنن:ج۲۷رص۳۰۸رقم،۵۸۹)

ترجمہ: جوکسی قوم کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے اس کا شمار اسی قوم کے ساتھ ہوگا اور جوکسی قوم کے عمل سے راضی ہوگا وہ اس کے عمل میں شریک مانا جائے گا۔

ابن مبارک نے کتاب الزہد والرقاق میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ بھی اسی طرح نقل کیا ہے، اور قریب انہی الفاظ میں ان سے روایت نقل کی ہے۔ (نصب الرایہ: ج۴/ص۳۴۶)

(۲) بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یغزو جیش الکعبة فاذا کانو ببیداء من الارض یخسف باولھم وآخرھم قالت، قلت یا رسول اللہ کیف یخسف باولھم و آخرھم و فیھم اسواقھم ومن لیس منھم قال یخسف باولھم وآخرھم ثم یبعثون علی نیاتھم۔

(بخاری مع فتح الباری باب ماذکر فی الاسوق کتاب البیوع :ج۶/ص۱۵۰، ترمذی :ج۲/ص۲۴،فتح الملھم:ج۶/ص۳۶۲)

ترجمہ: ایک لشکر کعبہ کی طرف جنگ کے لئے نکلے گا، جب وہ مقامِ بیداء کے پاس پہونچے گا، تو اس کا اول وآخر سب زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے؟ جبکہ ان میں بازار بھی ہوں گے، اور وہ لوگ بھی ہوں گے جو اس ارادہ سے ان لوگوں میں شامل نہ ہوں گے حضور ﷺ نے فرمایا سب دھنسا دیئے جائیں گے، البتہ قیامت کے دن اپنی نیتوں اور ارادوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ معصیت اور کفر کی مجلسوں میں شرکت کرنا اپنے کو ان میں شامل کرنے اور عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اس عموم میں غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات بھی داخل ہیں اس لئے ان میں شرکت گناہ ہے۔ اور اس ضمن میں جو بازار لگتے ہیں وہ بھی اسی میں شامل ہیں اس لئے بلاضرورت ان بازاروں میں جانا بھی مکروہ ہے ہمارے بزرگوں میں حضرت تھانویؒ کی رائے بھی یہی ہے البتہ مقتداء حضرات کے لئے سد اللذرائع ایسے مجمعوں سے احتراز کو وہ واجب قرار دیتے ہیں۔

(امدادالفتاویٰ: ج۲رص۱۴۰-۱۴۱)

اسی طرح غیر مسلموں کو ان کے تہواروں کی مبارک باد دینا بھی درست نہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے شرکیہ رسوم اور تہواروں کی تعظیم لازم آتی ہے، ایسے مواقع پر حکمت عملی سے ان کے تہوار کے بارے میں ضروری باتیں کی جاسکتی ہیں جن سے ان کی تالیف قلب بھی ہو جائے اور ان کے تہواروں کی تعظیم بھی نہ ہو۔

اسلامی تقریبات میں غیر مسلموں کی شرکت:

ایک مسئلہ اسلامی تقریبات مثلاً عید، یا افطار رمضان وغیرہ میں غیر مسلموں کی شرکت کا ہے، اس سلسلے میں فقہاء کے یہاں بہت زیادہ تصریح تو نہیں ملتی البتہ قربانی کے گوشت کے بارے میں فقہاء کہتے ہیں کہ غیر مسلم کو دے سکتے ہیں۔ (شامی وغیرہ)

امام غزالی نے حضرت حسنِ بصری کا مسلک نقل کیا ہے کہ وہ پڑوسی یہودی یا نصرانی کو قربانی کا گوشت کھلانے کی اجازت دیتے تھے۔

(احیاء علوم الدین بحث حقوق الجوار: ج۲رص۲۳۳)

اس پر قیاس کرتے ہوئے اگر غیر مسلموں کے لئے افطار یا عید کے ماکولات و مشروبات کا الگ نظم کر دیا جائے مسلمانوں کے ساتھ مخلوط نہ ہو تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

یہاں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ افطار وغیرہ کے مواقع، شریعت میں انتہائی متبرک مواقع ہیں، اور ان کو فی الجملہ عبادت کا درجہ حاصل ہے، ایسے متبرک مواقع پر کفر کی نحوست سے نقصان کا بہر حال اندیشہ ہے، اس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کی طرف سے جو افطار پارٹیاں دی جاتی ہیں، ان میں شرکت تو فی نفسہٖ ناجائز معلوم نہیں پڑتی لیکن مقصدِ افطار فوت ہو جاتا ہے، اس لئے کراہیت سے خالی نہیں ہے، اور اس پر مداومت گناہ ہے،

غیر مسلموں کی عبادتگاہوں کی تعمیر اور نقشہ سازی

باہمی روابط کی بنا پر اگر غیر مسلم، مسلمان انجینئروں سے خواہش کریں کہ وہ ان کی عبادتگاہوں کے نقشے بنائیں اور تعمیر کرائیں یا مسلمان مزدوروں سے تعمیری کام لینا چاہیں، تو امام ابوحنیفہؒ کے اصول پر اس کی گنجائش ہے، فتاویٰ ہندیہ میں اس سلسلے میں ایک صریح جزئیہ موجود ہے۔

ولو استاجر الذمی مسلما لیبنی له بیعة او کنیسة جاز ویطیب له الاجر کذا فی المحیط (فتاویٰ ہندیہ کتاب الاجارۃ : ......)

ترجمہ : اگر غیر مسلم کسی مسلمان سے گرجا یا کنیسا اجرت پر تعمیر کرنے کو کہے تو جائز ہے اور اجرت بھی حلال وطیب ہے۔

غیر مسلموں سے چندہ لینا اور دینا:

مساجد و مدارس کے لئے غیر مسلموں کا چندہ قبول کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ ثواب سمجھ کر دیں، مساجد و مدارس کے مصالح کے خلاف نہ ہو، مسلمانوں پر آئندہ ان کے احسان جتلانے کا اندیشہ نہ ہو، اور وہ اس کے بدلہ اپنے عبادت خانوں کے لئے مسلمانوں سے چندہ نہ طلب کریں، ان شرائط کے ساتھ ہمارے علماء نے غیر مسلموں کا چندہ لینے کی اجازت دی ہے۔

(امداد الفتاویٰ: ج ۲ /ص ۶۶۴ تا ۶۶۸، ج ۳ /ص ۱۲۹-۱۳۰)

شامی میں ہے............. **قوله وان یکون قربة فی ذاته الخ قال الشامی فتعین ان هذا شرط فی وقف المسلم فقط بخلاف الذمی لما فی البحر وغیره ان شرط وقف الذمی ان یکون قربة عند نا وعندهم کالوقف علی الفقراء و**

علی مسجد القدس (شامی: ج۳ ر ص ۳۶۰)

ترجمہ: فی نفسہ اس امر کا قربت ہونا ضروری ہے یہ صرف مسلم کے وقف کی شرط ہے برخلاف ذمّی کے اس لئے کہ بحر وغیرہ میں ہے کہ ذمّی کے وقف کی شرط یہ ہے کہ وہ چیز ہمارے اور ان کے نزدیک بھی عبادت ہو، مثلاً فقراء یا مسجد قدس پر وقف وغیرہ۔

البتہ قربت ہونے کے لئے واقف کے مذہب کا اعتبار ہوگا یا اس کی نیت کا مشہور قول یہ ہے کہ مذہب کا اعتبار ہے، لیکن حضرت تھانویؒ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ واقف کی رائے کا اعتبار ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ج۲ ر ص ۶۶۸)

غیر مسلموں کی عبادتگاہوں کے لئے مسلمانوں کا چندہ دینا درست نہیں اور اگر یہ امید ہو کہ غیر مسلم آئندہ ہم سے اپنی عبادتگاہوں کے لئے چندہ طلب کریں گے تو ان کا چندہ قبول کرنا بھی جائز نہ ہوگا، اگرچہ کہ وہ عبادت سمجھ کر دیں۔

جھنڈے کوسلامی دینا

غیر مسلم ممالک میں اقلیتیں بعض ایسے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں، جن کو دوسری قومیں محض سیاسی اور قومی مسئلہ سمجھتی ہیں، لیکن مسلمانوں کے لیے وہ مذہبی نوعیت کی ہوتی ہیں، مثلاً:

(الف) آج کل اکثر ملکوں میں جھنڈے کو سلامی دینے کا رواج ہے اور اسے جھنڈے کا احترام کہا جاتا ہے، جھنڈے کی سلامی کے وقت کسی شخص کا بیٹھا رہنا خلافِ ادب اور قومی جرم مانا جاتا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے ہمارے علمائے دیوبند میں اس سلسلے میں دو رجحانات پائے جاتے ہیں۔

(ا) ایک نقطۂ نظر مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ہے، مفتی صاحب موصوف کا فتویٰ ''نقیب'' پھلواری شریف پٹنہ میں شائع ہوا تھا، فتویٰ کی عبارت درج ذیل ہے:

''جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے، اور اسلامی ملکوں میں بھی ہوتی ہے وہ ایک فوجی عمل ہے، اس میں اصلاح ہوسکتی ہے، مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ عمل قرار دینا صحیح نہیں ہے''۔ (نقیب جلد ۷ پھلواری شریف پٹنہ، ۲۶/جمادی اول ۱۳۵۸ھ، ۹ جولائی ۱۹۳۹ء یکشنبہ)

بعض معاصر اہلِ علم نے بھی اس رائے کو قبول کیا ہے۔ (فتاوی رحیمیه)

البتہ بعض حضرات نے سیدھے کھڑے رہنے کو جائز قرار دیا ہے، اور ہاتھ جوڑنے یا سر جھکا کر تعظیم کرنے کو ناجائز کہا ہے۔

(موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی حل: صفحہ ۱۳۵ مولانا برہان الدین سنبھلی)

مگر اس نقطۂ نظر کی طرف سے کوئی معقول دلیل نہیں دی گئی ہے کہ جواز کی بنیاد کیا ہے؟ مسلم لیگ یا اسلامی ملکوں کے ذریعہ کسی کام کا انجام پانا حجت شرعیہ نہیں بن سکتا، اس کو فوجی عمل

کہنے سے بھی حکم شرعی کے اطلاق سے خارج نہیں کیا جا سکتا، اس میں کیا خرابی ہے؟ جس کی اصلاح ہوسکتی ہے؟ اور اصلاح کا طریقہ کیا ہوگا؟ اور اصلاح کے بعد جھنڈا کو سلامی دینے کا صحیح اسلامی طریقہ کیا ہوگا؟ ان سوالات میں سے کسی سوال کا کوئی تشفی بخش جواب اس نقطۂ نظر میں نہیں ملتا ہے۔

(۲) دوسرا نقطۂ نظر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے، حضرت کا مفصل فتوی ''امداد الفتاوی،، میں ''عجالۃ کشف الحجاب عن مسئلہ تعظیم بعض الانصاب،، کے نام سے موجود ہے، حضرت نے اس عمل کو ناجائز اور غیر اسلامی قرار دیا ہے، اور اپنے موقف کی دلیلیں بھی ذکر کی ہیں غور کیا جائے تو یہ دوسرا نقطۂ نظر دلائل کے لحاظ سے، زیادہ مضبوط ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) جھنڈے کو قومی شعار، اور ملکی وقار کی علامت مانا جاتا ہے، اسی لیے ہر ملک کا جھنڈا الگ الگ ہوتا ہے، اس کو تقریباً معبودیت کا مقام حاصل ہوتا ہے، اسی لیے اس کے ارد گرد لوگ کھڑے ہو کر قومی ترانے گاتے ہیں اور اس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، سرزمین وطن کی عزت کی علامت سمجھ کر غلامی و بندگی کے جذبات اس پر نچھاور کیے جاتے ہیں بوقت سلامی، جھنڈے کے پاس کسی کو بیٹھنے، کی اجازت نہیں ہوتی، سلامی کا وقت اور دن مقرر کیا جاتا ہے، ان تمام چیزوں پر پوری باریکی اور حساسیت کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ جھنڈا اس دور کا سب سے بڑا سیاسی بت ہے، جس کو ہم قرآن کی زبان میں ''الانصاب'' سے تعبیر کر سکتے ہیں ''الانصاب'' کی تعریف مفسرین نے یہ کی ہے:

''الانصاب'' وھی الاصنام المنصوبۃ للعبادۃ، ویذبحون عندھا والاصنام: ماصور وعبد من دون اللہ (روح المعانی: ج۷ ص۱۵)

''یعنی، انصاب'' سے مراد وہ بت ہیں جو بندگی کے لئے نصب کیے گیے ہوں، اور ان کے پاس لوگ اپنا ذبیحہ پیش کرتے ہوں، اور بت سے مجسمہ بھی مراد ہوسکتا ہے، اور اللہ کے علاوہ کوئی بھی چیز جو اس غرض سے نصب کی جائے،،

اسی جھنڈے کے اردگرد ''وندے ماترم'' پڑھا جاتا ہے ''وندے ماترم،، کے معنی ہی ہیں ''نذرانہ عبادت،، اس نظم میں اس جھنڈے کو عظمت وطن کا مظہر تصور کر کے غلامی و بندگی کا نذرانہ پیش کیا گیا ہے، اس طرح جھنڈے پر ،،انصاب ،، کی تعریف صادق آتی ہے ، اور انصاب کے بارے میں قرآن کا حکم صریح ہے۔

''یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر، والانصاب، والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون ،، (مائدہ:۸۹)

ترجمہ : اے اہلِ ایمان شراب، جوا، اور انصاب وازلام شیطان کے گندے اعمال ہیں، ان سے اجتناب کرو، تاکہ تم کامیابی حاصل کرو، اس حکم کی روشنی میں جھنڈے کی تعظیم واحترام اور اس کے پاس کھڑا ہونا یا اس کی پرارتھنا کرنا گناہ ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ غیر اسلامی ملکوں کا جھنڈا بھی غیر اسلامی ہوتا ہے، اور سلامی، غیر اسلامی جھنڈے کو دی جاتی ہے، یقیناً یہ سلامی، تعظیم واحترام کے اظہار کے لیے ہوتی ہے، ہمارے فقہاء نے غیر مسلم کو سلام کرنے کا جو اصول بیان کیا ہے، اس کو سامنے رکھا جائے تو اس کا حکم بھی دریافت کیا جاسکتا ہے، غیر مسلم کو اس کی عزت افزائی کے لیے سلام کرنا جائز نہیں، بعض فقہاء نے اس کو کفر تک کہا ہے البتہ کسی ضرورت کے تحت اس کو سلام کیا جاسکتا ہے، اس میں بھی سلام کے ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے براہ راست اس کی تعظیم نہ ہو، مثلاً ''سلام علی من اتبع الھدی،، وغیرہ (دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحظر والا باحتہ: ج۹ر ص۵۹۰ ''البحر الرائق ، کتاب الکراھیة' ج۸ر ص۳۷۴ر، فتاوی بزازیہ علی الھندیہ، کتاب الکراھیتہ ج۶ر ص۳۵۵ر فتاوی ھندیہ ، کتاب الکراھیة ج۵،ص۳۲۵، وغیرہ ذلک من الکتب الفقھیہ)

اس پر قیاس کرتے ہوئے کسی غیر اسلامی جھنڈے کو تعظیم کے لیے سلامی پیش کرنا جائز نہیں ہونا چاہیے، اور نہ اس کے لیے سدا سلامتی کی دعا کرنا جائز ہے، اس لیے کہ ذمی کی درازئی عمر اور سدا سلامتی کی دعاء کرنا جائز نہیں۔ (فتاوی بزازیہ ، کتاب الکراھیتہ ج۶ر ص۳۵۵)

رہ گئے وہ غیر اسلامی ممالک جس کے جھنڈے میں کوئی خاص رنگ مسلمانوں کی نمائند گی کے لیے بھی رکھا گیا ہو، مثلاً ہندوستان، اور سلامی کے وقت نیت صرف اس حصہ کی ہو، مگر حضرت تھانویؒ نے اس ذیل میں ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ اگر بالفرض مان لیا جائے کہ اس کے رنگوں میں ایک رنگ اسلامی ہے، مگر غیر اسلامی رنگوں کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے وہ بھی غیر اسلامی ہی کے حکم میں ہوگا، جس طرح کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کے ساتھ غیر اللہ کا نام بھی شامل کردے تو پورا ذبیحہ **ما اھل لغیر اللّٰہ** (یعنی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور) بن جاتا ہے۔ **واِن ذکر مع اسمہ تعالیٰ غیرہ ......فالاوجہ ان لا یعتبر الاعراب بل یحرم مطلقا...... لانہ اھل بہ لغیر اللّٰہ**

(فتاوی شامی ، کتاب الذبائح: ج۹ص۴۳۵۔۴۳۶)

ترجمہ: اگر اللہ کے نام کے ساتھ غیر اللہ کا نام شامل کردیا جائے تو زیادہ راجح قول یہ ہے کہ اعراب کا اعتبار کیے بغیر وہ مطلقاً حرام ہو جائے گا، اس لیے کہ وہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ جھنڈے کے اردگرد اس قیام کی حیثیت کیا ہے، خواہ سر جھکایا جائے یا نہیں؟ اور ہاتھ جوڑا جائے یا نہیں؟ علماء نے قیام پر کافی مفصل بحثیں کی ہیں جن کا یہ موقع نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ: قیام کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱) قیام لہ: یعنی کسی شخص کی آمد پر اس کے اکرام کے لیے اپنی جگہ پر کھڑا ہو جایا جائے، اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا جائے۔

(۲) قیام الیہ: یعنی کسی کی آمد پر اس کے لیے آگے بڑھ کر اس کا اکرام کیا جائے، یہ دونوں صورتیں اگر تعظیم کے لیے نہ ہوں بلکہ اکرام کے لیے ہوں تو جائز ہیں۔

(۳) قیام علیہ: یعنی کسی بیٹھے ہوئے شخص کے پیچھے کھڑا رہا جائے، اگر حفاظت مقصد ہو تو یہ صورت بھی جائز ہے، اور اگر تعظیم مقصود ہو جیسا کہ عجمیوں کے یہاں کا دستور ہے تو

جائز نہیں۔

(۴) قیام بین یدیہ: کسی بیٹھے ہوئے شخص کے سامنے غلامانہ کھڑا رہا جائے، یہ عجمیوں کا دستور تھا، یہ صورت ہر حال میں ناجائز ہے۔

ہر صورت پر دلیلیں اور تفصیلی بحثیں مطول کتابوں میں موجود ہیں، یہاں صرف وہ صورتیں میں نے لکھی ہیں جو بحث و تمحیص کے بعد منقح ہو چکی ہیں ۔

(دیکھئے اعلاء السنن ج۱۷/ص ۴۲۲، تا۴۲۴ اور فتح الباری ج۱۱/ص۴۱-۴۶)

یہ تقسیم قیام کی ہیئت کے لحاظ سے تھی ایک تقسیم قیام کے حکم کے لحاظ سے بھی کی گئی ہے۔

(۱) قیام ناجائز: کسی متکبر و مغرور کے احترام میں کھڑا رہنا، جو چاہتا ہو کہ لوگ اس کے پاس کھڑے رہیں۔

(۲) قیام مکروہ: ایسے شخص کے لیے قیام جو مغرور و متکبر نہ ہو، لیکن اندیشہ ہو کہ کھڑا نہ ہونے کی صورت میں آئندہ کبھی اس سے ضرر پہنچ سکتا ہے۔

(۳) قیام جائز: کسی کے ساتھ اکرام یا حسن سلوک کے طور پر کھڑا ہونا۔

(۴) قیام مستحب: کسی مسافر کی آمد پر خوشی کے اظہار کے لیے کھڑا ہونا، اور اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھنا یا کسی مصیبت زدہ کی تعزیت، یا کسی شخص کے کسی خاص عمل، یا نعمت کی تحسین کے لیے کھڑا ہونا۔ (فتح الباری: ج۱۱/ص۴۳)

یہ تمام تفصیلات علماء نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول، مختلف روایات کی روشنی میں طے کی ہیں، جھنڈے کی سلامی کے لیے کھڑا ہونا پہلی تقسیم کے لحاظ سے بالیقین ''قیام بین یدیہ'' میں شامل ہے، یا زیادہ سے زیادہ ''قیام علیہ'' برائے تعظیم میں شامل ہوگا، نہ کہ قیام برائے حفاظت میں، اور ان دونوں معنی کے لحاظ سے قیام ناجائز ہوگا۔

دوسری تقسیم کے لحاظ سے یہ یقیناً ''قیامِ ناجائز'' یا کم از کم ''قیام مکروہ'' میں شامل ہوگا، اور قیام برائے اکرام کی اجازت بھی فقہاء نے صرف اس صورت میں دی ہے جب کہ جس کے لیے قیام کیا جائے وہ مستحق تعظیم ہو اور اہلِ فضل و کمال میں سے ہو۔ درمختار میں ہے:

"یجوز بل یندب القیام تعظیماً للقادم الخ أی ان کان ممن یستحق التعظیم "(در مختار مع رد المحتار: ج۹ص۵۵۱)

آنے والے شخص کی تعظیم واکرام کے لیے کھڑا ہونا جائز بلکہ مستحب ہے بشرطیکہ وہ مستحق تعظیم ہو۔

اور جھنڈے کا مستحق تعظیم ہونا ثابت نہیں، اس لیے کہ "انصاب" اور "غیر اسلامی" دونوں لحاظ سے وہ تعظیم کا مستحق نہیں بنتا، اس لیے اس کے واسطے قیام جائز نہ ہوگا۔

البتہ ایسا شخص جو سرکاری ملازم ہو، یا وہ جھنڈے کے پاس قیام کرنے پر مجبور ہو، اور نہ کرنے کی صورت میں مالی یا بدنی نقصان کا اندیشہ ہو، ایسے شخص کے لیے "ذمّی" کو سلام کرنے کے ضابطہ کے مطابق، طبعی کراہت کے ساتھ جھنڈے کو سلامی دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

مسئلہ کی یہ تفصیل جھنڈے کو سلامی دینے، اور اس کے پاس تعظیماً کھڑے ہونے سے متعلق ہے۔

وندے ماترم' یا اس قسم کے دیگر قومی ترانوں کا حکم:

جہاں تک ایسے قومی ترانوں کا مسئلہ ہے جن میں مشرکانہ مضامین شامل ہوں، ایسے ترانے خواہ جھنڈے کے پاس ہوں یا کسی دوسرے مقام پر کسی جگہ پڑھنا یا گانا جائز نہیں، خود ہندوستان کے قومی ترانہ "وندے ماترم" میں بعض مشرکانہ مضامین شامل ہیں، "وندے ماترم" کے معنی ہیں، میں مادرِ وطن کی عبادت کرتا ہوں، "بندے" فارسی زبان کا لفظ ہے جو سنسکرت میں لیا گیا ہے چوں کہ دونوں زبانیں خاندانی طور پر متحد ہیں، دونوں "آرین" خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے لب ولہجہ کے فرق کے باوجود کئی مقامات پر لفظی اور معنوی طور پر متحد ہیں مثلاً اسبی بمعنی اسپ، اشٹمی بمعنی ہشتم وغیرہ ___ اس کے علاوہ ہندوؤں کے یہاں ارضِ وطن کی عبادت کا تصور پایا جاتا ہے مثلاً "دھرتی پوجا یا بھومی پوجا" ایک مخصوص عبادت ان کے یہاں معروف ہے، یہ تمام شواہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ "وندے ماترم" کے معنی ہیں "اے" ارضِ وطن! میں تیری عبادت کرتا ہوں" یہ مشرکانہ مفہوم ہے جس کو زبان پر لانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اور

اسی لیے آزادی کے بعد سے ہر دور میں علماء نے اس کی مخالفت کی ہے اور حکومت سے مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

علاوہ ازیں اس نظم میں کئی الفاظ ایسے نامانوس ہیں جن کے معنی معلوم نہیں، اور ایسے الفاظ زبان پر لانا جائز نہیں جس کے معنی معلوم نہ ہوں، کہ ممکن ہے ان میں شرک و کفر کے معنی ہوں۔ (شرح مسلم للنووی: ج ۲ ص ۲۱۹)

حضرت تھانویؒ نے بھی اس پہلو کے اعتبار سے قومی ترانہ کو ناجائز قرار دیا ہے جب کہ ان کے دور کا قومی ترانہ موجودہ دور کے ترانے سے مختلف تھا۔

(امداد الفتاویٰ: ج ۴ ص ۶۴۷)

نیز یہ غیر مسلموں کا شعار بن چکا ہے، ان کے ساتھ تشبہ بھی اس میں موجود ہے، اس اصول پر بھی اس کا پڑھنا ناجائز معلوم ہوتا ہے۔

البتہ ایسا شخص جو اس کے لیے مجبور ہو، اور ترانہ نہ پڑھنے کی صورت میں شدید نقصانات کا اندیشہ ہو ایسے شخص کے لیے بادل ناخواستہ یہ کلمات زبان سے دہرانے کی اجازت ہوگی، قرآن پاک کی اس آیت کی روشنی میں،

"الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان" مگر جن پر زبردستی کی جائے، اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، اگر چہ کہ اس صورت میں بھی عزیمت یہ ہے کہ زبان سے یہ کلمات ادا نہ کرے، لیکن اپنے تحفظ کے لیے مذکورہ کلمات زبان سے ادا کرنے کی رخصت ہے۔

باہمی نزاعات میں غیر اسلامی عدالتوں کے فیصلے

غیر مسلم ممالک میں ایک اہم ترین مسئلہ باہمی نزاعات میں عدالتوں سے ملنے والے فیصلوں کا ہے، عدالتیں یہاں مروج قانون شہادت یا دیگر قوانین کو بنیاد بنا کر فیصلے کرتی ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ عدالت نے اپنے فیصلہ کی بنیاد جس چیز پر رکھی ہو وہ فی الواقع فرضی ہو، یا اسلامی اصولوں کی روشنی میں غلط ہو، اور فریقین جانتے ہوں کہ فیصلہ غلط ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مقدمہ کے دونوں فریق مسلمان ہوں، تو ان کے لیے اس فیصلہ سے استفادہ کرنا شرعی طور پر جائز ہوگا یا نہیں؟

اس سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے اصول پر ایسے معاملات جن کو وجود میں لانے کا قاضی کو اختیار رہے، ان میں عدالتی فیصلہ سے استفادہ کرنا جائز ہے، اور جو معاملات اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہوں، ان میں عدالتی فیصلہ سے استفادہ درست نہیں ہے۔

اسی طرح ایسے معاملات جن میں سببِ ملک کی وضاحت نہ ہو کہ کس ذریعہ سے مدعی کو ملکیت یا حق ملکیت حاصل ہوئی ہے، مثلاً کسی زمین، جائداد، یا سامان پر ملکیت کا دعویٰ کرنے جیسے معاملات میں عدالت، حقیقت کے خلاف فیصلہ کر دے تو فیصلہ سے وہ چیز مدعی کے لیے فی الواقع حلال نہیں ہوگی، بلکہ اگر وہ مسلمان ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ حقیقت کے مطابق اللہ سے ڈرتے ہوئے، حق، حقدار کو پہنچائے، البتہ ایسے معاملات جن میں سببِ ملک کی وضاحت کی گئی ہو، مثلاً یہ چیز میری ہے اور میں نے اس کو فلاں سے خریدا ہے وغیرہ، یا نکاح و طلاق کے معاملات، ایسے معاملات میں عدالت کا فیصلہ نافذ ہوگا، اگرچہ کہ فیصلہ خلاف واقعہ صادر ہو لیکن فیصلہ کے بعد وہ چیز اس فریق کے لیے جائز ہو جائے گی جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے۔ اسی کو فقہی اصطلاح میں اس طرح بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ قضائے قاضی معاملات میں ظاہری اور باطنی دونوں طور پر نافذ ہوتا ہے یا صرف ظاہری طور پر، یہ مسئلہ قدیم سے فقہاء کے

درمیان مختلف فیہ رہا ہے حضرت امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک کسی بھی معاملہ میں عدالتی فیصلہ اگر خلافِ واقعہ صادر ہو، اور فریقین اس سے واقف ہوں تو یہ فیصلہ صرف ظاہری طور پر نافذ ہوگا، مگر حقیقی طور پر جیتنے والے فریق کے لیے اس سے استفادہ جائز نہ ہوگا، لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ کے یہاں مسئلہ کی وہی تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''واُما بیان ما یحله القضاء وما لایحله ، فا لاصل ان قضاء القاضی بشاهدی الزور فیماله ولایة انشائه فی الجملة، یفید الحل عند ابی حنیفةؒ وقضاؤهٗ بهما فیما لیس له ولایة انشائه اصلاً،لایفید الحل بالاِجماع، وعند ابی یوسف ومحمد، والشافعی رحمهم اللّٰه لایفید الحل فیهماجمیعاً ،،

(بدائع الصنائع: ج۵ص۴۵۸ کتاب القضاء)

امام ابوحنیفہؒ کے اس موقف کی بنیاد دو روایات ہیں۔

(۱) ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انکم تختصمون الیّ ولعل بعضکم الحن بحجته من بعض، واِنما انا بشر فمن قضیت له من مال اخیه شیئا بغیر حق فانما اقطعهٗ له قطعة من النار.

(بخاری شریف ، باب اثم من خاصم فی با طل وهو یعلمه ، کتاب المظالم : ۲۴۵۸)

ترجمہ : تم لوگ میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو، اور کبھی ایک فریق دوسرے سے زیادہ چرب زبان ہوتا ہے تو سنو، میں ایک انسان ہوں، اگر کسی کی چرب زبانی اور دلائل کی قوت سے متأثر ہو کر اس کے لیے ناحق اس کے بھائی کے مال کا فیصلہ کردوں تو سمجھو کہ میں اس کے لیے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں، یعنی کسی کے لیے فیصلہ صادر ہوجانے سے، ناحق چیز فی الواقع حق نہیں بن سکتی۔

(۲) دوسری روایت حضرت علی کی ہے:............**ذکر ابو یوسف عن عمرو بن ابی المقدام عن ابیه ان رجلامن الحیی خطب امراة وهو دونها فی**

الحسب، فابت ان تزوجه فادعی انه تزوجها واقام شاهدين عند عليٍ، فقالت: انی لم اتزوجه، فقال: قدزوجک الشاهدان فامضی عليها النکاح.

(احکام القرآن للجصاص الرازی ج۱رص۲۵۳)

ترجمہ: کسی قبیلہ کے ایک شخص نے کسی عورت کو پیغام نکاح دیا، حسب ونسب کے لحاظ سے وہ عورت سے کم تر تھا، عورت نے رشتہ مسترد کر دیا، مرد نے حضرت علی کے پاس دعویٰ پیش کر دیا کہ اس عورت سے اس کا نکاح ہو چکا ہے اور دو گواہ بھی گزار دیے، حضرت علی نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا، اس عورت نے عرض کیا کہ حقیقت یہ ہے کہ میرا نکاح نہیں ہوا ہے، تو حضرت علی نے فرمایا تمہارے گواہوں نے تمہارا نکاح کر دیا، حضرت علی نے اس نکاح کو نافذ فرمایا، حضرت علی سے اس قسم کا فیصلہ تفریق نکاح کے سلسلہ میں بھی منقول ہے۔

(احکام القرآن ج۱ص۳۵۳)

ظاہر ہے کہ حضرت علی کا یہ فیصلہ ''مدرک بالقیاس،، نہیں ہے اس لیے علماء نے اسکو حدیث مرفوع کے درجہ میں رکھا ہے علاوہ ازیں کسی صحابی سے حضرت علی کے اس فیصلے سے کسی صحابی کا اختلاف منقول نہیں ہے، اس طرح یہ اجماع سکوتی کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔

(اعلاء السنن: ج۱۵رص۱۱۳)

ان دونوں روایت کو سامنے رکھتے ہوئے امام صاحب نے مذکورہ بالا موقف اختیار کیا ہے، حضرت علی کی حدیث کو نکاح وطلاق اور ایسے معاملات سے متعلق کیا، جن میں سبب ملک کی وضاحت موجود ہو، اور حضور ﷺ کے مذکورہ بالا فرمان کو عام معاملات سے متعلق قرار دیا ہے، اس طرح دونوں روایت میں تطبیق بھی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک معتدل، معقول اور شاندار نقطۂ نظر بھی سامنے آجاتا ہے، موجودہ دور میں اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اسلام میں تمدنی وحدت کی کوئی گنجائش نہیں ہے

امتِ مسلمہ تمام اقوامِ عالم کے درمیان اپنی ایک شناخت رکھتی ہے، اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی حال میں اپنے دینی اور ملی امتیازات ترک نہیں کیے، اقتدار میں رہی تب بھی، اور اقتدار سے محروم ہوئی جب بھی، دنیا کی کسی قوم اور مذہب کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے، ان کی قومی اور سیاسی زندگیوں میں مذہب کبھی طاقتور عنصر کی حیثیت سے نہیں رہا، کلیسا کا عبوری دور، مذہب کا دور مانا جاتا ہے مگر اس کی شدت پسندی نے مذہب کو فائدہ پہنچانے کے بجائے، نقصان ہی پہنچایا، نیز اس کی مدّت اتنی مختصر رہی کہ اس کو شمار میں نہیں لایا جاسکتا۔

اس لیے وہ تمام طاقتیں جن کو امتِ مسلمہ کا یہ امتیاز آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہے، چاہتی ہیں کہ مذہب اس امت کی زندگی سے بھی نکل جائے، اور اس کے لیے ان کے یہاں مختلف تدابیر اور منصوبے زیرِ غور اور زیرِ عمل ہیں عالمی طور پر ثقافتی انجذاب، اور تمدنی وحدت کی تحریک بھی اسی کا ایک حصہ ہے کہ ایک ایسی وحدت قائم کی جائے جس میں کسی مذہب کا اپنا وجود نہ ہو، سب مل کر کام کریں اور تمام کی اچھی اور لائق اتفاق باتوں کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے، اور وہی اس وحدت کا لائحۂ عمل ہو، اس لیے کہ ہر مذہب خدا ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے، راستے الگ الگ ہیں لیکن منزل سب کی ایک ہے۔

تاریخی جائزہ سے پتا چلتا ہے کہ تمدنی اور ثقافتی وحدت وانجذاب کا یہ تصور بہت قدیم ہے اور ہر دَور میں اہلِ کفر، اہلِ ایمان سے یہی خواہش کرتے رہے ہیں کہ اپنا امتیاز ترک کر کے ہماری وحدت میں شامل ہوجائیں خود قرآن کا بیان ہے۔

”ودوا لوتكفرون كما كفروا، فتكونون سواء فلا تتخذوا منهم اولياء، (نساء:۸۸)

ترجمہ: اہلِ کفر خواہش رکھتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کفر قبول کرلو تاکہ تم ان کے برابر ہو جاؤ مگر ان کی خواہش پر ہرگز عمل نہ کرو اور ان سے دوستانہ وحدت قائم نہ کرو۔

یعنی ہر ایسی وحدت اسلام میں مسترد کردی جائے گی، جو ہمیں اسلام سے کھینچ کر کفر سے قریب کردے شیطان، نار کی طرف کھینچتا ہے، اور رحمان جنت کی طرف، نار کی طرف جانے والا راستہ قابلِ رَد ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے ہر دَور میں اہلِ دنیا کے لیے بعض بنیادیں ایسی موجود رہی ہیں جو ان کو ایک وحدت وانجذاب کی لڑی سے منسلک رکھتی تھیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے حوالہ سے قرآن نے بیان کیا ہے:

انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بينكم فى الحيوٰة الدنيا

(عنکبوت:۲۴)

ترجمہ: تم لوگوں نے اللہ کے علاوہ چند بُت بنا رکھے ہیں، جو دنیوی زندگی میں تمہاری باہم وحدت ومحبت کا ذریعہ ہیں۔

یہ بت ہر دور کے لحاظ سے مختلف ہوتے رہتے ہیں لیکن بُت خواہ جو بھی شکل اختیار کرلے وہ بت ہی رہے گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے قبل پوری انسانیت ایک وحدت پر تھی، پیغمبروں اور رسولوں کے سلسلے نے ہی اس وحدت کو توڑا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ رسولوں کی تعلیمات صحیح طور پر ہمارے پاس موجود ہو اور عہدِ جاہلیت کی وہ وحدت دوبارہ لوٹ کر آجائے؟

قرآن کہتا ہے:............ **وكان الناس امة واحدة، فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين** (البقرہ:۸۷)

ترجمہ: تمام لوگ پہلے ایک ہی امّت تھے، پھر اللہ نے نبیوں کو مبشر ونذیر بنا کر مبعوث فرمایا۔

اس لیے مختلف مذاہب واقوام کے درمیان مذہب سے قطعِ نظر تمدنی وثقافتی انجذاب کا

تصوّر سراسر غیر اسلامی، اور اسلام دشمن سازشوں کا ایک حصہ ہے، مسلمانوں کے لیے یہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

اسلام مکمل خودسپردگی کا نام ہے:

مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ قرآن کے اس حکم کی تعمیل کریں، جو بڑی قطعیت کے ساتھ قرآن نے دیا ہے۔

یایھا الذین آمنوا ادخلو فی السلم کافۃ، ولا تتبعوا خطوات الشیطان،

(البقرہ:۲۰۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پوری طرح داخل ہوجاؤ اور شیطانی راستوں کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت کے نزول کا تاریخی پس منظر سامنے رکھیں تو بات اور بھی زیادہ صاف ہوجائے گی بعض نو مسلم حضرات جو پہلے یہودی تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام، اور اسد بن عبید وغیرہ ان لوگوں نے سوچا کہ اسلام پر قائم رہتے ہوئے سابقہ مذہب کے بعض ان احکام کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جائے جو اسلامی احکام سے متصادم نہ ہوں، اس آیتِ کریمہ میں دراصل اسی سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے کہ محض اسلام قبول کرلینا کافی نہیں ہے، بلکہ اسلام میں پورے طور پر داخل ہونا ضروری ہے، بایں طور کہ اس میں کسی دوسرے مذہب وقوم کا کوئی شائبہ تک باقی نہ رہے۔

''**کافۃ**'' کی تشریح کرتے ہوئے زیادہ تر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ اس کا تعلق داخل ہونے والے سے نہیں، بلکہ اسلام سے ہے کہ اسلام کے تمام شرائع واحکام کو قبول کرنا، مسلمان کے لیے لازم ہے، ادھورا اسلام، یا مِلا جُلا اسلام، خدا اور رسول کے نزدیک معتبر نہیں۔ (دیکھئے تفسیر ابن کثیر: ج۱/ص۲۳۵، تفسیر کبیر للامام الرازی: ج۳/ص۲۰۸، الجامع لاحکام القرآن: ۳/ ۱۸)

اور اسی سے مِلتا جُلتا ایک پس منظر تھا جس میں حضرت عمر ''تورات'' کا نسخہ لے کر آگئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، لب ولہجہ کی شدّت وگرمی محسوس فرمائیے۔

والـذی نـفـس محمد بیده لو بدالکم فاتبعتموهٔ و ترکتمونی لضللتم عـن سـواء السبیـل و لوکان حیا و ادرک نبوتی لاتبعنی (رواه الـدارمـی، مشکاة شریف:۳۲)

تـرجـمـہ : اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر تمہارے سامنے موسیٰ ظاہر ہوں اور تم مجھ کو چھوڑ کر ان کی اتباع کرنے لگو تو تم گمراہ قرار پاؤ گے، یقین رکھو اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میرا عہدِ نبوت پاتے تو میری اتباع کرتے۔

یہاں صرف اس درجہ کا ایمان قابلِ قبول ہے جو حضور کی ناراضی کے بعد حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا:

أعـوذ بـالله من غضب الله وغضب رسوله رضینا بالله ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا (مشکاة شریف :۳۲)

تـرجـمـہ : میں اللہ اور رسول کے غضب سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، ہم اللہ سے راضی ہیں بحیثیت رب اور اسلام سے راضی ہیں بحیثیت مذہب، اور محمد ﷺ سے راضی ہیں بحیثیت نبی۔

نیز نبی اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر غیر مسلموں کی مخالفت کرنے کے جو احکام دیئے ہیں (جن کا ذکر تفصیل کے ساتھ پہلے گذر چکا ہے) ان کی روح بھی یہی تہذیبی وتمدنی اختلاط سے پرہیز ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس اسلام کو غیر اسلامی تہذیبی اختلاط گوارہ نہیں اس کو مکمل غیر اسلامی تہذیبی وحدت کیسے قابلِ قبول ہوسکتی ہے؟ استغفر اللہ!!

غیر مسلموں کی طبقاتی جنگ میں مسلمانوں کا کردار

غیر مسلموں کی باہم طبقاتی جنگ یا کش مکش میں مسلمانوں کو اولاً ایک فعالِ ثالث کا کردار ادا کرنا چاہئے، اور طبقاتی کش مکش ختم کر کے باہم امن وسلامتی کا ماحول بنانا چاہئے، اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم درجہ یہ ہے کہ ظالم کے بجائے مظلوم کے ساتھ اخلاقی ہمدردی رکھی جائے، جہاں تک ظالموں کے مقابلے میں مظلوم طبقہ کا قانونی یا فوجی طور پر ساتھ دینے کی بات ہے وہ ملک وقوم کے حالات وظروف پر موقوف ہے، اگر حالات اجازت دیں اور مسلمان اس پوزیشن میں ہوں کہ مظلوم طبقہ کا ساتھ دینے سے ظلم مٹ سکتا ہو اور امن و انصاف کو فروغ مل سکتا ہو تو مسلمانوں کو ایسا ضرور کرنا چاہئے، جس طرح کہ ''حبشہ'' میں حضرت زبیر نے کیا تھا، تفصیل پہلے گذر چکی ہے، لیکن اگر مسلمان اس پوزیشن میں نہ ہوں یا حالات ناسازگار ہوں اور مظلوم طبقہ کا ساتھ دینے سے خود مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرہ میں پڑ سکتے ہوں تو ایسی حالت میں قلبی اور اخلاقی طور پر مظلوم کے ساتھ ہمدردی برتی جائے گی، عملی اقدام کے لیے میدان میں اترنا ضروری ہے، بلکہ مناسب بھی نہ ہوگا، اس وقت مکہ میں قیام کے دوران روم اور فارس کی جنگ میں حضور ﷺ اور مسلمانوں کا جو طرزِ عمل رہا، وہی ہمارے لیے بہترین اسوہ ہوگا۔

اس لیے کہ عزت وآبرو، یا جان ومال کو خطرہ میں ڈال کر ظلم یا گناہ کا ختم کرنا مطلوب نہیں ہے، ظلم یا گناہ کے خلاف آواز اٹھانا بڑے ثواب اور فضیلت کا کام ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ پہلے آواز اٹھانے والا اپنی حیثیت خوب اچھی طرح جان لے، اور اس کا، جان ومال اور عزت وآبرو پر کیا ردِ عمل ہوگا، اسکا اچھی طرح اندازہ کر لے، اس کے بعد ہی اس کے لیے میدانِ عمل میں اترے۔

اس باب میں ہمیں بعض صحابہ کرام کے طرزِ عمل سے روشنی ملتی ہے۔

حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن (مشہور ظالم) حجاج کی تقریر سنی، اس میں اس نے بہت سی غلط باتیں کہیں، میں نے سوچا کہ اس کی اصلاح کروں، اور اس کو غلطی پر متوجہ کروں، لیکن مجھے فرمانِ رسول ﷺ یاد آیا کہ: **لا ینبغی للمومن ان یذل نفسہ** ''مومن کے لیے جائز نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا، اپنے کو ذلیل کرنے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: اپنے کو ایسے خطرات میں مبتلاء کرنا جن سے حفاظت کی طاقت نہ ہو۔

(رواہ الطبرانی والبزار و اسناد الطبرانی جید، مجمع الزوائد: ج۲رص۲۷۴)

امام احمد نے قاضی شریح کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ عیاض بن غنم نے ہشام بن حکیم کو ایک خاص واقعہ پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

اے ہشام! رسول اللہ ﷺ سے جو تم نے سنا وہ ہم نے بھی سنا ہے، اور جو تم نے دیکھا ہے وہ ہم نے بھی دیکھا ہے، کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا۔

من اراد ان ینصح لذی سلطان بامر فلا یبد لہ علانیۃ ولکن لیاخذ بیدہ فیخلو بہ، فان قبل منہ فذاک، والا کان قد ادی الذی علیہ.

جو شخص کسی صاحبِ طاقت شخص کو کسی بات کی نصیحت کرنا چاہے تو علی الاعلان نہ ٹوکے بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تنہائی میں لے جائے، اگر قبول کر لے تو بہتر ہے، ورنہ اس نے تو اپنا حق ادا کر دیا۔

اور تم اے ہشام جری ہو، تم نے صاحبِ طاقت کے خلاف جرأت کا مظاہرہ کیا، تجھے خطرہ نہیں ہوا؟ کہ وہ اگر قتل کر دیتا تو اس سلطان کا قتیل کہلاتا۔

(مجمع الزوائد: ج۵رص۲۲۹۔۲۳۰)

''طبرانی'' اور ''احمد'' کی روایت ہے کہ سعید بن جمہان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوامامہ سے کہا کہ سلطان، لوگوں پر ظلم کر رہا ہے، اور ایسا ویسا کر رہا ہے، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبا دیا اور پھر بعد میں کہا، اے ابن جمہاں! سوادِ اعظم کی پیروی کرو، اگر

سلطان تیری بات سُن سکتا ہوتو اس کے گھر جا اور اپنی باتوں سے آگاہ کر، اگر قبول کرلے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو چھوڑ دے، کہ صاحبِ معاملہ اپنی چیزوں کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔

(مجمع الزوائد: ج۶ ص۲۳۲)

امام ابو یوسف کی کتاب "الخراج" میں ہے کہ ایک شخص حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا: اے امیر المومنین! میں اللہ کی باتوں میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتا، خواہ وہ میرے لیے بہتر ثابت ہو یا نہ ہو، حق بات کہہ ہی دیتا ہوں، اس پر حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا:

اما من ولی من امر المؤمنین شیئا فلا یخاف فی اللہ لومة لائم، ومن کان خلوا من ذلک فیقبل علی نفسه ولینصح لولی امره .

ترجمہ : جو شخص کسی ذمّہ دارانہ منصب پر فائز ہو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرے، لیکن جو اس سے خالی ہو اسے پہلے اپنی پوزیشن دیکھنی چاہئے، اور اپنی ذات کا خیال رکھنا چاہئے، اور ذمّہ داروں کے ساتھ اس کا رَویہ خیر خواہانہ ہونا چاہئے۔ (کتاب الخراج لابی یوسفؒ :۱۶)

ان آثار وروایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مظلوم طبقہ کا ساتھ دینے کی ذمّہ داری اس وقت عائد ہوتی ہے جب کہ ساتھ دینے والا شخص اقتدار میں ہو، بصورتِ دیگر اپنے حالات اور اپنی پوزیشن دیکھ کر قدم اٹھانا ضروری ہے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمان اقتدار سے محروم ہیں، اور حالات اتنے سازگار نہیں کہ مسلمان کسی کا کھل کر ساتھ دے سکیں، اس لیے مسلمانوں کو یہاں پہلے اپنی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی فکر کرنی چاہئے، اس کے بعد ہی درجہ ہے دوسروں کی قانونی یا اخلاقی امداد کا۔

ہنگامی مواقع پر غیر مسلموں کی امداد

یقیناً اسلام میں خدمتِ خلق کی بڑی اہمیت ہے، اور انسانیت کے ناطے اسلام ہر ایک کی خدمت کرنے کا حکم دیتا ہے، انسان تو انسان اسلام جانوروں کی خدمت کو بھی باعثِ اجر قرار دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: **ان لنا فی البھائم اجرا ؟**، چوپایوں میں بھی ہم کو اجر ملے گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’**فی کل ذات کبد رطبۃ اجر**‘‘ ہر زندہ جگر والی مخلوق میں اجر ہے، (بخاری و مسلم ، اعلاء السنن: ج۱۶ر ص۱۵۲)

اسلام حسبِ توفیق ساری انسانیت کی خدمت کا حکم دیتا ہے، اور انسانی بنیاد پر غیر مسلموں کی نصرت واعانت کی اجازت ہی نہیں ترغیب دیتا ہے۔

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئیں جب کہ وہ مشرک تھیں، قریش سے معاہدہ کا زمانہ تھا، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی اور عرض کیا کہ میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی مدد کرسکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں کرو۔

(متفق علیہ ، مشکوٰۃ:۴۱۸-۴۱۹)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا:

الخلق عیال اللّٰہ، فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ

(رواہ البیھقی، مشکوٰۃ : ۴۲۵)

ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے، اللہ کو سب سے زیادہ وہ شخص پسند ہے، جس کا برتاؤ اس کی مخلوق کے ساتھ زیادہ اچھا ہو۔

اس طرح کی متعدد احادیث موجود ہیں، جو انسانی بنیادوں پر تمام انسانوں کی خدمتِ

خلق کی ترغیب دیتی ہیں، اس لیے اگر مسلمان خدمتِ خلق کا کوئی ادارہ قائم کریں یا قدرتی آفات کے موقع پر امدادی اسکیم لے کر چلیں تو حتی المقدور غیر مسلموں کو بھی اس میں شامل کریں، مسلمانوں سے دوہرے رشتہ کی بنا پر ان کو اولیت ضرور دی جائے گی، لیکن اگر گنجائش ہو تو غیر مسلموں کو بھی اس میں ضرور شامل کرنا چاہئے، بالخصوص ہندوستان جیسے ممالک میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے، غیر مسلموں میں اس سے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھا ماحول پیدا ہوگا۔

رہا یہ کہ بعض شدت پسند عناصر ایسے مواقع پر مسلمانوں کے ساتھ امتیاز کا معاملہ کرتے ہیں تو ان کا کردار ان کے لیے ہے، لیکن ہم اسلام کی اعلیٰ اخلاقیات ہر گز ترک نہیں کریں گے، تمام اقوام عالم میں یہی ہمارا امتیاز ہے۔

اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ جو قطع رحمی کرے، اس کے ساتھ ہم صلہ رحمی کریں، جو ہم پر ظلم کرے اس کو ہم معاف کردیں۔ اور جو ہمارے ساتھ بُرا سلوک کرے، ہم اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

اہلِ مکہ نے حضور ﷺ اور مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم کیے، لیکن جب مکہ میں قحط پڑا، اور حضرت ابوسفیان حضور ﷺ کے پاس دعاء کی درخواست لے کر آئے، آپ نے ان کے لیے دعا فرمادی اس لیے کہ آب و دانہ ایک انسانی ضرورت ہے، اور اس موقع پر انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی۔

حضرت ثمامہ بن اثال نے اہلِ مکہ کو رسد بھیجنے پر پابندی لگادی، اہلِ مکہ نے حضور ﷺ سے درخواست کی تو آپ نے حضرت ثمامہ کو ہدایت کی کہ جس طرح پہلے مکہ غلہ آتا تھا اسی طرح آنے دیا جائے۔ (مسند احمد بن حنبل: ج۲/ص۲۴۸، الوثائق السیاسیة: ۷۵-۷۶)

اس لیے غیر مسلموں کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ جو بھی رہے، لیکن مسلمانوں کو اپنے اسلامی اخلاق اور اصولوں کو چھوڑنا ہر گز مناسب نہیں، واللہ اعلم بالصواب، وعلمه اتم و احکم.

نیک خواہشات

یہ تمام مسائل ومشکلات، احساسات دلاتے ہیں کہ کسی غیر مسلم ملک میں کسی مسلمان کا قیام ایک مجبوری ہوسکتی ہے، خواہ وہ دینی اعتبار سے ہو یا دنیوی اعتبار سے کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں شوق ورغبت سے تو بہر حال قیام نہیں کرسکتا ہے، ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے ملک میں، اپنے نظام زندگی کے تحت اور اپنے بھائیوں کے درمیان زندگی گذارے، لیکن زندگی میں کبھی ایسے مرحلے بھی آتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ چیزوں کو پسند کرنا پڑتا ہے، اور بادل ناخواستہ ان چاہی چیزوں کو انجام دینا پڑتا ہے۔

اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ اپنے ان بھائیوں کے سامنے جو چاہی یا ان چاہی غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں، اپنی کچھ خواہشات رکھوں، اور ان سے اپنی اس آرزو کا اظہار کروں کہ جب آپ نے پوری طرح ان ملکوں میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو تو خدارا اپنی زندگی کے لیے ایسا نظام مرتب کیجئے جس سے آپ غیر مسلم اکثریت کے درمیان ایک باعزت پر امن، مخلص اور ترقی پسند اقلیت کی طرح زندگی گذار سکیں، یقیناً آپ کو اپنے وطن کی یاد ستاتی ہوگی، یا ان اسلامی ملکوں کا تصور پریشان کرتا ہوگا جہاں آپ کے لیے آپ کے خیال میں ترقی وسکون کے زیادہ امکانات ہوتے، یہ اور فطری تقاضا ہے اس کو انسان کبھی نظر انداز نہیں کرسکتا ہے، بلکہ وطن اور بچپن کی یادیں اور اپنے ملکوں کا تصور انسان کا قیمتی سرمایہ ہیں..............اور اسلام اس جذباتی کیفیت کی قدر کرتا ہے۔

حضرت بلالؓ مدینہ میں رہتے ہوئے جب اپنے وطن مکہ کی یاد میں اشعار گنگناتے تھے، تو سرکار دو عالم ﷺ کی آنکھیں بھی نم ہوئے بغیر نہیں رہتی تھیں،

لیکن اب آپ نے جس سرزمین کو اپنے وطن کے طور پر چنا ہے آپ کے تمام تر نیک جذبات کا مظہر وہی ہونا چاہئے اسی پر اپنی محبت کے پھول نچھاور کیجئے، اور وہاں کی تعمیر وترقی،

اوراس ملک کے لوگوں کے ساتھ خیر خواہی آپ کی اولین ترجیحات میں شامل ہونا چاہئے،

نبی اکرم ﷺ کا اسوہ اس سلسلے میں بہترین اسوہ ہے، نبی اکرم ﷺ ایک طرف مکہ کے فراق میں پڑھے ہوئے اشعار سنکر نمدیدہ ہوجاتے تھے، تو دوسری طرف آپ کا طرز عمل مدینہ منورہ کی سرزمین میں ہجرت کے ساتھ کتنا خیر خواہانہ تھا، کہ آپ نے اس سرزمین کی برکت اور دفع امراض کے لیے دعائیں کیں وہاں کی جنگجو قوموں کے درمیان مصالحت کرائی، وہاں یہودیوں کی بڑی تعداد آباد تھی نئے اتحاد میں ان کو بھی شامل فرمایا اور انتہائی قیمتی جملہ تحریر کرایا:

"ان الیھود امة مع المومنین للیھود دینھم الامن ظلم او اثم فانہ لایھلک الانفسه"

ترجمہ: یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہیں یہود اپنے مذہب پر قائم رہیں گے، البتہ جو ظلم یا گناہ کرے گا اس کا نقصان خود اسی کو ہوگا۔

انبیاء کا یہ اسوہ بھی سامنے رکھئے کہ کہ ہر نبی نے اپنی غیر مسلم قوم کو "یا قوم" کہہ کر مخاطب فرمایا، (سورہ نوح:۲/،اعراف :۶۱-۶۵/، سورہ ھود:۵۰/)

اسی طرح آپ کے دلوں میں اپنے ہم وطنوں کے لیے نفرت کے نہیں محبت وخلوص کے جذبات رہیں۔

اسی کے ساتھ آپ اپنے اس فرض منصبی کو فراموش نہ کریں کہ اپنے ہم وطنوں کی اصلاح، اور ان کے ساتھ دینی خیر خواہی آپ کا بنیادی امتیاز ہے، اور اس امتیاز کو ترک کر کے اقوام عالم کے درمیان آپ اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتے، آپ صرف روٹی یا عہدہ کا بندہ بن کر نہ رہ جائیں بلکہ اپنے فکر وعقیدہ کی سلامتی کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کی دینی سلامتی کی بھی فکر رکھیں، اور اس کے لیے مختلف تدابیر بھی کرتے رہیں، انشاءاللہ آپ کی کوشش رائگاں نہیں جائے گی،

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلمات نے یہی طرز عمل اختیار کیا تھا، سورہ ہود میں ہے۔

ان ارید الاالاصلاح مااستطعت وماتوفیقی الابالله (ہود:۸۸)

ترجمہ: میرا ارادہ صرف اپنی وسعت بھر اصلاح ہے اور توفیق تو اللہ ہی کی جانب

سے ملتی ہے۔

مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ میں ایمانی فراست اور علم و معرفت سے بہرہ ور ہوں، آپ اپنے مذہبی علوم کے ساتھ دنیا کی تہذیبوں، اور اقوام کی تاریخوں کا بھی مطالعہ کریں، قوموں کے عروج و زوال پر بھی نظر ڈالیں، حقائق و واقعات کی گہرائیوں تک پہونچیں، اور قرآن جیسی کتاب ہدایت آپ کے پاس موجود ہے وہ کیا رہنمائی کرتی ہے اس پر غور کریں۔

حضرت ربعی بن عامر کا یہ جملہ سنہری حرفوں میں لکھنے کے لائق ہے۔

ان اللّٰہ ابتعثنا لنخرج العبادمن عبادۃ العباد الی عبادۃ رب العباد، ومن ضیق الدنیا الی سعۃ الدنیا والا خرۃ ومن جورالدیان الی عدل الاسلام

(الضوابط المنھجیۃ لفقہ الاقلیات ص۹۳)

ترجمہ: بیشک اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے تا کہ ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی اور دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا اور آخرت کی وسعت کی طرف، اور تمام ادیان کے جبر و جور سے نکال کر اسلام کے عدل و مساوات کے سایہ میں پہونچائیں۔

آپ جہاں کہیں رہیں اپنے دین فطرت اور ملت اسلامیہ کے سچے نمائندہ بنکر رہیں، اس لیے کہ غیر مسلم اسلام کو کتاب میں نہیں بلکہ مسلمانوں کی زندگی میں پڑھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اتق اللّٰہ حیث ماکنت واتبع السیئۃ الحسنۃ تمحھا وخالق الناس بخلق حسن (ترمذی، کتاب البر والصلہ، باب ماجاء فی معاشرۃ الناس، حدیث ۲۰۵۳)

ترجمہ: جہاں رہو اللہ سے ڈرو، برائی کے بعد اچھائی کرو، جو برائی کا اثر مٹا دے، اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا معاملہ کرو۔

غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ عدل واحسان کا معاملہ کریں، مکر و فریب اور غدر و خیانت سے بچیں، اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں۔

لا ینھاکم اللّٰہ عن الدین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم عن

دیارکم ان تبروھم وتقسطعواالیھم ان اللّٰہ یحب المقسطین (ممتحنہ :۸)

ترجمہ : جولوگ تم سے آمادۂ جنگ نہیں ہیں اور نہ تم کوملک بدر کرنا چاہتے ہیں، اللہ ان کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، بے شک اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے۔

اپنے ملکوں میں جاری قوانین اور روایات کا احترام کریں، اس لیے کہ آپ اسی معاہدہ کے ساتھ ان ملکوں میں داخل ہوئے ہیں، اور عہد شکنی کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں۔

اوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا (سورۂ اسراء :۳۴)

ترجمہ: اور عہد پورا کرو عہد کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا۔

وہاں جو مشکلات درپیش ہوں ان کا مثبت حل تلاش کریں منفی حل سے گریز کریں اس سے آپ کی سلامتی فکر اور دینی نمائندگی کا اظہار ہوگا، ارشاد باری تعالی ہے۔

ھل جزاء الاحسان الاالاحسان (سورۂ رحمٰن:۶۰)

ترجمہ: نیکی کا بدلہ صرف نیکی ہے۔

معاشرہ میں کسی ناجائز طریقہ کا رواج ہوتو یہ صرف بتا دینا کافی نہیں ہوگا کہ یہ ناجائز ہے، بلکہ اس کا متبادل جائز راستہ بتانا بھی آپ کا اور آپ کے علماء کا منصبی فریضہ ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں،.......... ''مفتی سے اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کا سوال کرے جن کی اس کو ضرورت ہوتو صرف یہ بتانے پر اکتفاء نہ کرے کہ وہ ناجائز ہے، بلکہ بتائے کہ جائز راستہ کیا ہے یہی عالم ناصح کی شان ہوتی ہے، اس کی مثال ایک شفیق ڈاکٹر کی ہوتی ہے، جو صرف پرہیز نہیں بتاتا، دوائیں بھی تجویز کرتا ہے، ادیان اور ابدان کے طبیبوں کی شان یہی ہونی چاہیئے۔

(اعلام الموقعین لابن القیم ج۴ص۱۵۹)

اس طرح آپ ایک بہتر امت بنکر اقوام عالم کے درمیان رہیں اللہ آپ کی اور ہم سب کی حفاظت کرے، اور اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول کرے، آمین۔

اہل مطالعہ چند اہم کتابیں

۱	حقوق انسانی کا اسلامی منشور	مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی		مطبوعہ
۲	غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل	//	//	مطبوعہ
۳	منصب صحابہ	//	//	مطبوعہ
۴	قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز	//	//	زیر طبع
۵	حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فقہی مقام	//	//	زیر طبع
۶	موجودہ عہد زوال میں مسلمانوں کے لیے اسلامی ہدایات	//	//	زیر طبع
۷	سیرت طیبہ کے بعض امتیازی پہلو	//	//	زیر طبع

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ربانی منوروا شریف، پوسٹ سوہما، وایا بتھان، ضلع سمستی پور (بہار) انڈیا

MAKTABA-H.JAMIA RABBANI MANORWA SHARIF
P.o, SOHMA. Via, BITHAN. Disst, SAMASTIPUR.
(BIHAR) INDIA 848207. Phon, 9473136822-9934082422
E-mail: jamia.rabbani@gmail.com

شعبۂ تحقیق وتصنیف جامعہ ربانی کی

قابل مطالعہ چند اہم کتابیں

نمبر	کتاب	مصنف		کیفیت
۱	حقوق انسانی کا اسلامی منشور	مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی		مطبوعہ
۲	غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل	//	//	مطبوعہ
۳	منصب صحابہ	//	//	مطبوعہ
۴	قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز	//	//	زیر طبع
۵	حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فقہی مقام	//	//	زیر طبع
٦	موجودہ عہد زوال میں مسلمانوں کے لیے اسلامی ہدایات	//	//	زیر طبع
۷	سیرت طیبہ کے بعض امتیازی پہلو	//	//	زیر طبع

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ربانی منورواشریف، پوسٹ سوہما، وایا بتھان، ضلع سمستی پور (بہار) انڈیا

MAKTABA-H.JAMIA RABBANI MANORWA SHARIF

P.o, SOHMA. Via, Bithan. Distt, Samastipur.
(BIHAR) INDIA 848207. Phon, 9431208629
E-mail; Jamia-rabbani@maktoob.com